اقرارِ جرم

ایم اے راحت

پہلی قسط

انسپکٹر شاہ میر نے سامنے رکھی فائل کو بند کر کے ایک طرف رکھا اور طویل سانس لے کر ریوالونگ چیئر کو پیچھے جھکا کر کمر نکالی۔ اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر بائیں سمت کی میز کی طرف اٹھ گئیں جہاں صفورا بیٹھی ہوتی تھی۔ صفورا کی خالی کرسی دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایس۔ آئی صفورا بیگ کسی کیس کی تفتیش کے لیے گئی تھی۔ ابھی اس نے اردلی کو بلانے کے لیے گھنٹی نہیں بجائی تھی کہ دروازے سے اے۔ ایس۔ آئی زمان شاہ ایک نوجوان کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے سلام کرنے کے بعد نوجوان کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

شاہ میر نے اس نوجوان کو ایک نظر دیکھا۔ نوجوان پتلون، قمیص میں ملبوس تھا اور چہرے سے پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ جسم بھی کافی تندرست اور مضبوط نظر آتا تھا۔

”بیٹھیے!“ شاہ میر نے نرم لہجے میں کہا اور نوجوان نے شکریہ کے انداز میں گردن خم کی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ایک غم آلود کیفیت پھیلی ہوئی تھی۔

”فرمایئے، کیا بات ہے؟“

”میرا نام طاہر علی ہے۔“

”جی......!“

”سر! میں گرفتاری دینے آیا ہوں۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور شاہ میر نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کس سلسلے میں......؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نے اپنی بھابی کو قتل کر دیا ہے، اس کی لاش گھر میں پڑی ہوئی ہے۔“

”کیوں قتل کیا ہے تم نے اپنی بھابی کو؟“

”سر! بہت سے لوگوں کی طرح میں ایک جذباتی انسان ہوں، آپ یوں کہہ لیں ذہنی طور پر نامکمل! میرا بھائی اسپتال میں داخل ہے اور میری بھابی بہت خوبصورت تھی، میں غیر شادی شدہ ہوں بس مجھ پر شیطنت سوار ہو گئی، میں نے جنون کے عالم میں اپنی بھابی پر مجرمانہ حملہ کیا جس کی اس نے شدید مدافعت کی اور میں نے مشتعل ہو کر اس کی گردن دبا دی اور وہ ہلاک ہو گئی۔“

شاہ میر کے چہرے کے عضلات میں تھوڑی سی اکڑن پیدا ہوئی، پھر اس نے کہا۔ ”اپنا پتا بتاؤ۔“

نوجوان اپنا پتا دہرانے لگا۔ شاہ میر نے زمان شاہ سے کہا۔ ”موبائل تیار کرواؤ اور اسے تحویل میں لے لو۔“

زمان شاہ نے نوجوان کی کلائی پکڑ کر اسے اٹھایا، ایڑیاں بجائیں اور اس کو لے کر باہر نکل گیا۔ شاہ میر کے چہرے پر کبیدگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ نوجوان کے چہرے کو دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور اچھا نوجوان ہے لیکن اس نے جو بتایا تھا، وہ انتہائی گھناؤنا عمل تھا۔ البتہ اپنے اس جرم کے بعد اس کے اندر کے محاسب نے اسے بے سکون کر دیا اور وہ ضمیر کی ضربیں برداشت نہ کر کے تھانے آ گیا۔

”اف......!“ شاہ میر کے منہ سے آواز نکلی اور وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ پولیس کیپ سر پر رکھی اور رول اٹھا کر باہر نکل آیا۔ باہر موبائل تیار تھی۔ چار کانسٹیبلوں نے نوجوان کو ہتھکڑی لگا کر اندر بٹھا رکھا تھا۔ موبائل کے ڈرائیور کو زمان شاہ نے پیچھے بٹھا دیا تھا پھر جب خوبرو اور اسمارٹ پولیس انسپکٹر شاہ میر اندر بیٹھ گیا تو زمان شاہ نے موبائل اسٹارٹ کر کے اسے ریورس کیا اور تھانے کے گیٹ سے باہر نکال کر سیدھے راستے پر آگے بڑھا دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر شاہ میر نے کہا۔ ”کیا کہتے ہو زمان شاہ اس کیس کے بارے میں......؟“

”سر......! کبھی کبھی انسان جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔“ پولیس موبائل کا سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ طاہر علی نے زمان شاہ کو تفصیل سے پتا بتا دیا تھا چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد موبائل ایک متوسط علاقے میں پہنچ گئی جو بہت پرانا آباد نہیں تھا۔ ایک مکان کے سامنے زمان شاہ نے گاڑی روک دی۔ مکان کے سامنے کوئی موجود نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ کسی کو اس مکان میں ہونے والی واردات کے بارے میں معلوم نہیں ہوا تھا۔ لوگ کسی قدر سنسنی خیز نظروں سے پولیس کی گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔

البتہ جب طاہر علی کو ہتھکڑیاں لگے اترتے دیکھا تو چاروں طرف افراتفری سی پھیل گئی۔ اس دوران زمان شاہ، طاہر علی سے حاصل کی ہوئی چابی لے کر تالا کھول چکا تھا۔ زمان شاہ اندر داخل ہو گیا، دو سپاہی دروازے پر تعینات ہو گئے۔ گھر کا ماحول بہت صاف ستھرا تھا۔ جس کمرے میں لاش پڑی ہوئی تھی، وہاں بہت خوبصورت فرنیچر موجود تھا۔ یہ بیڈ روم تھا۔ بستر کی چادر سخت شکن آلود تھی، ایک تکیہ بیڈ سے نیچے گرا ہوا تھا۔ لاش کمرے کے درمیان فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ مقتولہ ایک بے حد دلکش عورت تھی۔ سیاہ گھنے بالوں کے درمیان دودھ جیسے رنگ کا چہرہ جواب زندگی سے محروم تھا، لیکن اس عالم میں بھی دلکش نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی جو دل پر عجیب سا تاثر چھوڑتی تھی۔ زمان شاہ اسے دیکھ کر جذباتی ہو گیا۔ اس نے خونخوار نگاہوں سے طاہر علی کو دیکھا تھا۔

انسپکٹر شاہ میر نے لاش کا جائزہ لینے کے بعد زمان شاہ سے کہا۔ ”فوٹو گرافر اور دوسرے اسٹاف کو بلا لو۔“

ضروری کارروائیوں کی تکمیل میں کافی وقت لگ گیا۔ اس دوران گھر کے باہر پڑوس کے کافی لوگ جمع ہو گئے تھے اور باہر موجود لوگوں سے استفسار کر رہے تھے۔ لاش کو اٹھوانے سے پہلے شاہ میر نے زمان شاہ سے کہا کہ چند معزز لوگوں کو گواہ کے طور پر لے آؤ۔ زمان شاہ باہر نکل گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ چار افراد کے ساتھ واپس آیا جن میں دو بزرگ اور دو درمیانی عمر کے مرد تھے۔ ان کے چہرے تصویر حیرت بنے ہوئے تھے۔ لاش کو دیکھتے ہی ایک بزرگ کے منہ سے نکلا۔

”ارے خدا کی مار، اسے کس موذی نے مار دیا...... ارے یہ تو فرشتہ جیسی تھی۔“

”آپ کا کیا نام ہے بزرگ......؟“ شاہ میر نے پوچھا۔

”ایمان علی!“

”آپ یہاں کتنے عرصے سے رہتے ہیں؟“

”بیس سال سے۔“

”ایمان علی صاحب! طاہر علی نے اپنی بھابی کو قتل کرنے کی ذمہ داری قبول کی ہے اور خود تھانے جا کر اپنی گرفتاری دی ہے، آپ لوگوں کو گواہی دینی ہے۔“

”ارے یہ تو بڑی فرشتہ صفت بچی تھی، اسے کیوں مار دیا اس مردود نے! ارے خدا اسے غارت کرے، بے چاری کا شوہر اسپتال میں پڑا ہے، اس نے ایسا کیا کر دیا؟“

باقی لوگوں بھی طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ سب گواہی دینے کے لیے تیار ہو گئے اور کچھ دیر کے بعد ایمبولینس آ گئی اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا گیا۔ باہر پورا محلہ جمع تھا، عورتیں چھتوں پر چڑھی ہوئی تھیں، گواہوں کی موجودگی میں گھر کا جائزہ لیا جانے لگا۔ اس کی تفصیل تیار کی گئی، پھر مکان کو سیل کر دیا گیا اور دو پولیس کے جوانوں کو گھر پر تعینات کر کے شاہ میر چاروں گواہوں اور طاہر علی کو لے کر تھانے آ گیا جہاں اس نے گواہوں سے سوالات کرنے شروع کر دیئے۔

”ہاں طاہر علی! اب تم تفصیل بتاؤ، مقتولہ کا کیا نام تھا؟“

”سعیدہ بیگم......!“

”تمہارے بھائی کا نام؟“

”افسر علی!“

”ان دونوں کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟“

”چار سال۔“

”سعیدہ کے والدین کہاں رہتے ہیں؟“

”سر! ایک معذور باپ ہے ان کا، دو بھائی تھے جو انہیں چھوڑ کر کہیں چلے گئے، ماں پہلے ہی مر گئی تھی، بھائیوں نے گھر بیچ دیا اور اب بھابی کے والد مسجد میں رہتے ہیں۔“

”تمہارا بھائی کب سے بیمار ہے؟“

”کوئی سات مہینے ہو گئے۔“

”کیا بیماری ہے اسے......؟“

”کینسر ہے، وہ زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔“

”تمہاری بھابی سے تمہارے کیسے تعلقات تھے؟“ شاہ میر نے پوچھا اور طاہر علی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”جواب دو۔“ شاہ میر نے سرد لہجے میں کہا۔

”بھائیوں کی طرح چاہتی تھی مجھے!“

زمان شاہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسی وقت طاہر علی کی گردن مروڑ کر پھینک دے۔ اس نے مشکل سے خود پر قابو پایا تھا۔

ضروری کارروائی کے بعد طاہر علی کو لاک اپ کر دیا گیا۔ زندگی کے بہت سے شعبے بڑے حساس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر جو مریضوں کا علاج کرتے ہیں، وہ سر توڑ کوشش کر کے انہیں زندگی کی طرف لاتے ہیں اور جب موت انہیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیتی ہے تو وہ ان کی لاشیں ان کے لواحقین کے حوالے کر کے دوسرے مریضوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ پولیس کی ذمہ داری بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس پُر درد کہانی نے شاہ میر کے ذہن پر کیا اثر کیا۔ اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کے لیے ہدایات دیں اور زمان شاہ سے دوسری باتیں کرنے لگا۔ مثلاً یہ کہ سعیدہ کے کیس کی پیروی کرنے والا کوئی نہیں ہے نیز یہ کہ اس کی تدفین بھی سرکاری طور پر کرائی جائے گی، پھر وہ زمان شاہ کے ساتھ اس اسپتال کی طرف چل پڑا جہاں افسر علی زیر علاج تھا۔ افسر علی تک پہنچنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ افسر علی بے حد خوبصورت آدمی تھا۔ زمان شاہ کو یہ دیکھ کر بھی بہت دکھ ہوا، کتنی خوبصورت جوڑی تھی۔ افسر علی سے بات کرنے سے پہلے شاہ میر نے ڈاکٹر سے اس کے مرض کی نوعیت دریافت کی تو ڈاکٹر نے کہا۔ ”زندگی موت اللہ کے ہاتھ ہے لیکن وہ زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے، کسی بھی وقت موت اسے اپنے ہمراہ لے جا سکتی ہے۔“

اس کے بعد وہ افسر علی سے ملے جو انہیں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ شاہ میر نے اس کی خیریت پوچھ کر اسے زندگی کی دعائیں دیں، پھر اس سے کہا۔ ”ہم آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہیں افسر صاحب! بڑے ناگزیر حالات میں آپ کو ملاقات کی زحمت دی ہے، ہمیں یہ خبر دیتے ہوئے بہت دکھ ہے کہ آپ کی بیوی سعیدہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔“

شاہ میر جانتا تھا کہ ایک بیمار آدمی کے لیے یہ خبر کتنی روح فرسا ہو سکتی ہے لیکن قانونی طور پر بتانا ضروری تھا۔

افسر علی حواس باختہ ہو گیا۔ پہلے کچھ دیر وہ پھٹی پھٹی نظروں سے شاہ میر کو دیکھتا رہا۔ پھر پھٹ پڑا۔ ”قتل کر دی گئی سعیدہ! ارے سعیدہ قتل ہو گئی، کیسے...... کیسے! کس نے مار دیا اسے! ارے وہ تو میری زندگی کی دعائیں مانگتے مانگتے مری جاتی تھی، میرے ساتھ اسپتال میں رہنا چاہتی تھی۔ کہتی تھی خدا کرے مجھے بھی کینسر ہو جائے تاکہ ہم دونوں اسپتال میں ساتھ رہیں اور ساتھ مر جائیں۔“

پھر افسر علی ایسے بلک بلک کر رویا کہ شاہ میر اور زمان شاہ کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کچھ دیر کے بعد اس نے سنبھل کر کہا۔ ”مگر اسے کس نے اور کیوں قتل کر دیا...... ہم تو ویسے ہی نیم مردہ لوگ تھے، ہماری کس سے دشمنی ہو گئی؟“

”اسے آپ کے بھائی طاہر علی نے قتل کیا ہے۔“

”کیا......؟“ افسر علی حیرت سے اچھل پڑا۔

”ہاں! اس نے خود اپنی گرفتاری پیش کی اور قتل کا اعتراف کیا۔“

”ناممکن جناب! ناممکن...... خدا کی قسم زمین آسمان ایک ہو جائیں، سورج سمندر میں ڈوب جائے، کائنات تاریک ہو جائے مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم تینوں تو پڑوسیوں اور جاننے والوں کے لیے ایک مثال تھے، وہ اپنی بھابی کو بہت چاہتا تھا، اسے اپنی سگی بہن کا درجہ دیتا تھا۔ میں آپ سے ایک درخواست کروں، سعیدہ چلی گئی، میں بھی جلدی چلے جانا چاہتا ہوں لیکن میرے بھائی نے ابھی دنیا میں کچھ نہیں دیکھا، اسے بچا لیں، سچائیاں تلاش کریں، وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ میرا ایمان ہے، یہ میرا خدا پر بھروسہ ہے، آپ پوری تفتیش کریں، دیکھ لیجیے گا حقیقت کچھ اور نکلے گی، ہاتھ جوڑتا ہوں آپ کے معلوم کریں چھان بین کریں، وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔“

”آپ براہ کرم مجھے پوری تفصیل بتایئے اپنے، اس کے اور مقتولہ کے بارے میں۔“ شاہ میر نے نرمی سے کہا۔

”ہم تینوں کالج میں ساتھ تھے، ہم نے ایک ساتھ گریجویشن کیا پھر میں نے ایک فرم جوائن کر لی، تھوڑے عرصے کے بعد طاہر بھی نوکر ہو گیا، ہم دونوں گھر کے حالات بہتر بنانے میں مصروف ہو گئے۔ سعیدہ بہت اچھی لڑکی تھی، ماں بچپن میں مر چکی تھی، دو بھائی تھے جنہوں نے ان باپ، بیٹی کو چھوڑ کر اپنی دنیا الگ بسا لی۔ باپ نے انتہائی مشکل حالات میں بھی بیٹی کو تعلیم دلائی لیکن پھر وہ شدید بیمار ہو گئے۔ میں سعیدہ کو بہت چاہتا تھا اور یہ بات طاہر کو معلوم تھی۔ ملازمت ملتے ہی طاہر نے خود آگے بڑھ کر سعیدہ کے والد سے ملاقات کی اور میری سعیدہ سے شادی ہو گئی۔ ہمارا گھر آباد ہو گیا لیکن ہماری خوشیاں دیرپا نہ رہیں، خدا جانے مجھے یہ بیماری کیوں لگ گئی، بس یہ ہے میری کہانی!“

”آپ دونوں ایک ہی جگہ نوکری کرتے تھے؟“

”نہیں! وہ دوسری فرم میں تھا، فرم میں وہ بے حد ہر دلعزیز ہے اور ایک اچھا انسان گردانا جاتا ہے، میرا بھائی میری زندگی کے لیے شدید محنت کر رہا تھا، اسے ایک ہی لگن تھی کہ کسی طرح پیسے جمع کر کے مجھے علاج کے لیے ملک سے باہر لے جائے۔“

”افسر علی صاحب! اس نے قتل کا اعتراف کر کے خود کو قانون کے حوالے کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس نے اپنی بھابی پر مجرمانہ حملہ کرنے کے بعد اسے قتل کر دیا ہے، پھر ضمیر کی ملامت برداشت نہ کر کے خود کو سزا دلوانا چاہتا ہے، ان حالات میں یہ بہت مشکل مرحلہ ہے لیکن میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اس کی بھرپور تفتیش کروں گا اور اصلیت تلاش کروں گا۔“

”آہ کاش! میں اس وقت تک زندہ رہوں جب میرا بھائی اس جرم سے آزاد ہو جائے۔ انسپکٹر صاحب! کیا میں اس سے مل سکتا ہوں، ہمارا کوئی نہیں ہے، کون اس کے کیس کی پیروی کرے گا؟“

”آپ اللہ پر بھروسہ کریں، میں بذات خود اس کیس کی تفتیش کروں گا اور قانون کسی بے گناہ کو سزا نہیں ہونے دے گا۔“

”پتا نہیں...... پتا نہیں ہم کیوں اس عتاب کا شکار ہوئے ہیں۔“

شاہ میر واپس آ گیا۔ طاہر علی کی شخصیت کے بارے میں وہ پہلے ہی الجھن میں تھا۔ اس کی چھٹی حس کہتی تھی کہ یہ اس طرح کا انسان نہیں لگتا کہ ایسا مکروہ جرم کرے۔ اب افسر علی سے ملنے کے بعد وہ مزید الجھ گیا تھا، تاہم اس نے اپنے اسٹاف کو ہدایت کی کہ لاک اپ میں طاہر علی کو کسی طرح کی تکلیف نہ دی جائے۔

پھر اس نے پوری تفصیل صفورا کے سامنے رکھ دی۔ صفورا ایک ذہین پولیس آفیسر تھی، شاہ میر کو اسسٹ کرتی تھی، شاہ میر سے محبت کرتی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں مستقبل کے خواب تھے اور تعبیر کے لیے وہ وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

صفورا نے پوری توجہ سے تفصیل سنی، دیر تک سوچتی رہی، پھر بولی۔ ”گڑبڑ تو ہے سر......! اگر اس پوری کہانی پر غور کیا جائے تو بہت سی جگہ کہانی مشکوک ہو جاتی ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے، اگر کسی کے ماضی کے بارے میں صحیح علم ہو جائے تو اس کے حال کے کچھ نشانات مل جاتے ہیں۔ دونوں بھائیوں کا پیار، سعیدہ، طاہر کے لیے ایک مقدس ہستی تھی، انسان کے اندر لمحاتی وحشت نمودار ہو بھی جائے تب بھی اس کے اندر کا انسان اسے روکتا ہے، اسے رشتوں کا احساس دلاتا ہے، بہت ہی غیر معمولی حالات میں وہ ایسے جرم کا مرتکب ہوتا ہے جبکہ اس کیس میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی۔“

”ہاں! میں اعتراف کرتی ہوں، آپ نے طاہر کے گھر کی تلاشی لے لی ہے؟“

”ہاں! زمان شاہ نے......!“

”آپ نے خود نہیں لی؟“

”نہیں......!“ شاہ میر نے کہا۔

”چلیں......؟“ صفورا بولی۔

”کہاں؟“

”ایک بار اور تلاشی لینی ہو گی، وقت ہماری تفتیش کو آگے بڑھانے کا انتظار کر رہا ہے، ملزم اگر بے گناہ ہے تو اس کی بے گناہی کے ثبوت ہمارے منتظر ہیں، آیئے انسپکٹر شاہ میر! دیر نہ کیجیے۔“

”چلو...... زمان شاہ باہر ہی ہو گا۔“ کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ سیل کھلوا کر طاہر علی کے گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ زمان شاہ نے روایتی طور پر طاہر علی کے گھر کی تلاشی لی تھی لیکن صفورا کا انداز مختلف تھا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایک تیر مار ہی لیا۔

اس نے خصوصی طور پر وہاں موجود کاغذات کا جائزہ لیا تھا اور اسے ایک پاس بک ملی تھی جس میں، بینک کی اس پاس بک میں کوئی دس دن قبل پانچ لاکھ روپے جمع کرائے گئے تھے۔ چیک طاہر علی کے نام کا تھا اور کسی فرم نے اسے دیا تھا۔

”پانچ لاکھ کا چیک لیکن براہ راست طاہر علی کے نام...... گویا اس کا تعلق طاہر علی کی کمپنی سے نہیں ہے لیکن وہ کس فرم سے جاری ہوا ہے۔“ واپسی پر خصوصی توجہ اس پاس بک پر تھی۔

”طاہر علی کی فرم سے اس کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنی ہوں گی، پھر یہ دیکھنا ہو گا کہ جس فرم نے اسے پانچ لاکھ روپے کا چیک دیا ہے، اس سے طاہر علی کا کیا تعلق ہے، کیا نام ہے اس فرم کا؟“

”ذیشان ایم کو......!“

”یہاں سے معلومات حاصل کرنا ہوں گی کہ اس فرم نے یہ چیک ذاتی طور پر طاہر علی کو کیوں دیا، نمبر دو بینک سے طاہر علی کا اکاؤنٹ چیک کرنا ہو گا۔“

”یہ دونوں کام میں کر لوں گی سر!“

”تیسرا کام میں خود کر لوں گا۔“ شاہ میر نے کہا۔

”جی سر......!“ صفورا نے کہا۔ پھر چونک کر بولی۔ ”وہ کیا سر......؟“

”تم سے شادی!“ شاہ میر نے کہا۔

”بہتر......!“ صفورا نے پوری سنجیدگی سے کہا پھر دونوں ہنس پڑے۔

☆......☆......☆

شاہ میر کی ذہین اسسٹنٹ صفورا ابراہیم نے شاہ میر کو بڑی جامع رپورٹ دی۔ ”کالج میں افسر علی اور سعیدہ کی جوڑی بڑی رومانی جوڑی مشہور تھی۔ دونوں زمانے سے بے نیاز ایک دوسرے کے پیار میں گم تھے اور طاہر علی ان دونوں کے پیار کے رکھوالے کے طور پر جانا جاتا تھا لیکن ہیرو، ہیروئن کے ساتھ ولن نہ ہو تو فلم پوری نہیں ہوتی۔“

”او مائی گاڈ......! ہماری کہانی میں ولن کون ہے، مجھے تو ابھی تک کوئی نہیں نظر آیا، پلیز میری مدد کرو۔“ شاہ میر نے شوخی سے کہا۔

”ابھی اس کی انٹری نہیں ہوئی، پتا چلا تو سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گی آفیسر!“ صفورا بولی۔

”اوکے! آگے......؟“ شاہ میر نے کہا۔

”جی سر......! تو ولن کا نام ہے ذیشان فاروقی!“

”ذیشان...... او ذیشان ایم کو! یعنی وہ فرم جہاں سے طاہر کو پانچ لاکھ کا چیک ایشو ہوا، ویری گڈ!“ شاہ میر نے دلچسپی سے کہا۔

”جی سر......! یہ مسٹر ذیشان فاروقی بھی اسی کالج میں تھے اور سعیدہ کے عشق میں گرفتار تھے مگر سعیدہ نے کبھی ان کی طرف رخ نہیں کیا اور وہ رقیب فاروقی کے نام سے مشہور ہو گئے۔“

”ماشاءاللہ......! ذیشان فاروقی کا شجرہ کیا ہے؟ وہ فرم انہی کی ہے نا......؟“ شاہ میر نے کہا۔

”سو فیصد! میں ان کی تفصیل بتا رہی ہوں، مسٹر ذیشان نے ان لوگوں کے کالج چھوڑنے کے ساتھ خود بھی کالج چھوڑ دیا تھا، وہ بھی متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، کالج چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد تک وہ کسی انسٹیٹیوٹ سے کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کرتے رہے، پھر انہوں نے ایک بینک میں ملازمت حاصل کر لی، وہاں انہوں نے اپنا بہتر مقام بنا لیا اور بینک نے انہیں ٹریننگ کے لیے بیرونِ ملک بھیج دیا، وہاں سے واپسی کے بعد ذیشان صاحب کے حالات ہی بدل گئے، انہوں نے بینک سے استعفیٰ دیا تو بینک نے ان سے اپنے اخراجات کا مطالبہ کر دیا جو انہوں نے بآسانی ادا کر دیئے اور پھر تھوڑے ہی عرصے کے بعد انہوں نے اپنی فرم ذیشان ایم کو بنالی...... یہ اچھی خاصی بڑی فرم ہے اور مسٹر ذیشان اس کے ڈائریکٹر ہیں۔“

شاہ میر نے تعریفی نظروں سے صفورا کو دیکھا۔ صفورا نے اس پر توجہ دیئے بغیر کہا۔ ”طاہر علی کے بینک سے معلومات کی گئی تو پتا چلا کہ اس نے تھوڑے عرصے پہلے یہ اکاؤنٹ کھلوایا تھا اور پھر اس میں تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کرتا رہا تھا جو سات ہزار ایک سو بنے تھے بعد میں یہ پانچ لاکھ کا چیک جمع کرایا گیا۔ اس کے علاوہ طاہر علی کے قریبی لوگوں سے معلومات کی گئی تو پتا چلا کہ وہ آفس سے چھٹی کے بعد ایک اور جگہ نوکری کرتا تھا اور بارہ بجے کے قریب فارغ ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ وہ اپنے بھائی کو علاج کے لیے بیرونِ ملک لے جانا چاہتا تھا۔“

”آپ کی کارکردگی لاجواب ہے صفورا!“

”شکریہ سر......! ایک آخری کام جو میں نے کیا ہے، وہ اس کیس میں سب سے اہم ہے۔“

”اوہ! بتایئے؟“

”سر! میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا بغور جائزہ لیا ہے، ایک بہت خاص بات معلوم ہوئی ہے، طاہر علی کے بارے میں، پوری معلومات کی ہے میں نے، وہ اپنے بھائی سے بہت محبت کرتا ہے اور اس کی صحت کے لیے سخت پریشان تھا، پیسے جمع کرنے کے لیے وہ ڈبل نوکری کر رہا تھا۔ خاص بات یہ ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں قتل کا جو وقت متعین کیا گیا ہے، اس وقت طاہر علی اس دوسری نوکری پر تھا اور وہاں سے معلومات کرنے سے پتا چلا کہ اس وقت طاہر اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا، آفس انچارج نے اس کی وہاں موجودگی کی تصدیق کی ہے۔“

”او مائی گاڈ! واقعی یہ سب سے اہم پوائنٹ ہے مس صفورا! کسی طرح انچارج کو سختی سے یہ ہدایت پہنچاؤ کہ یہ بات وہ کسی اور کو نہ بتائے۔“

”میں نے اسے یہ ہدایت کر دی ہے جناب! اس کا نام ہدایت اللہ ہے، اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ یہ بات کسی کو نہیں بتائے گا۔“

شاہ میر تھوڑی دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا، پھر بولا۔ ”دلچسپ سچویشن ہے، اس نے بہت گھناؤنا الزام اپنے سر لیا ہے، آخر کیوں......؟ کیا واقعی اس سے کوئی لمحاتی لغزش ہو گئی تھی، پوسٹ مارٹم رپورٹ اس کا اظہار بھی کرتی ہے۔“

”جی سر......! لیکن ذیشان ایم کو کی طرف سے پانچ لاکھ کا چیک بے حد مشکوک ہے جبکہ ذیشان سے ان تینوں کرداروں کا پرانا تعلق بھی ہے۔“

”جیسا کہ پتا چلتا ہے کہ طاہر علی کو اپنے بھائی سے بہت پیار تھا، وہ ہر قیمت پر اس کی زندگی بچانا چاہتا تھا اور اسے باہر لے جانے کے لیے اسے پیسے کی ضرورت تھی، کسی طرح اس کی ملاقات ذیشان سے ہو جاتی ہے، ذیشان کو اس کی مجبوری کا علم ہو جاتا ہے اور وہ اسے پانچ لاکھ روپے کی پیشکش کر دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ اسے سعیدہ کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع دے۔

طاہر علی، بھائی کی زندگی بچانے کے لیے اس مذموم کام پر تیار ہو جاتا ہے اور ذیشان اپنے مقصد کی تکمیل کر لیتا ہے، پھر اپنے ٹھکرائے جانے کے انتقامی جذبے سے مغلوب ہو کر وہ سعیدہ کو قتل کر دیتا ہے پھر جب طاہر علی گھر آتا ہے اور چہیتی بھابی کو اس حال میں دیکھتا ہے تو اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور وہ اپنی بھابی کی اس کیفیت کا ذمہ دار سمجھ کر خود کو قاتل کی حیثیت سے پولیس کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔“

”گڈ......! ذیشان فاروقی ایک اچھا کلیو ہے، اس کی شخصیت بھی توجہ کے قابل ہے، وہ ان کے ساتھ پڑھتا تھا، پھر اس نے بینک میں نوکری کی بینک کی طرف سے ٹریننگ پر اسے بھیجا گیا اور وہ جہاں بھی گیا، وہاں سے اتنا دولت مند ہو کر آیا کہ اس نے بینک کی نوکری چھوڑ دی، اس کے واجبات بھی ادا کر دیئے اور ایک شاندار فرم بھی کھول لی اور صرف اپنی ایک پسندیدہ لڑکی کے حصول کے لیے پانچ لاکھ خرچ کر دیئے۔“

”بالکل یہی بات ہے۔“

”طاہر علی نے تو یہ قدم اٹھا لیا ہے، وہ ایک اقبالی مجرم ہے۔ لیکن سر......! بات کچھ دل کو لگتی نہیں ہے، کوئی گرہ ضرور ہے، جس کے کھلنے سے کچھ اور سامنے آئے گا۔“

”ہاں بیشک...... زمان شاہ کو بلاؤ۔“ شاہ میر نے کہا اور کچھ دیر کے بعد زمان شاہ نے آ کر سیلوٹ کیا۔ شاہ میر نے اسے مختصر تفصیلات بتا کر کہا۔ ”ذیشان فاروقی کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کر کے رپورٹ کرو۔“

”یس سر......!“ زمان شاہ نے کہا۔

دوسری ملاقات شاہ میر نے طاہر علی سے کی۔ اس نے اسے تفتیش کے کمرے میں طلب کر لیا تھا۔ طاہر علی نے اسے سلام کیا تو شاہ میر نے جواب دے کر اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔

شاہ میر غور سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا۔ ”طاہر علی! ہم تمہارے کیس کی تفتیش کر رہے ہیں، ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”اگر گستاخی تصور نہ کریں تو ایک عرض کروں انسپکٹر صاحب! میں نے ایک مکروہ جرم کیا ہے، میرے ضمیر نے ملامت کی تو میں نے خود کو قانون کے حوالے کر دیا، میں جانتا ہوں کہ میرے اس جرم کی سزا موت ہے، مجھے اس وقت سکون ملے گا جب میں پھانسی کے پھندے پر لٹک جاؤں گا، پھر آپ مزید تفتیش کیوں کر رہے ہیں؟“

”قانون کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں طاہر علی! تم سے جو پوچھا جائے، تم اس کا تسلی بخش جواب دو۔“

”میں حاضر ہوں۔“

”جو کہانی تم نے سنائی ہے، وہ سچ ہے؟“

طاہر نے چونک کر شاہ میر کو دیکھا، پھر بولا۔ ”اس سے بڑا سچ اور کیا ہو گا کہ انسان اپنے لیے موت مانگ لے؟“

”تم جھوٹ بول رہے ہو، خیر......! تمہارے بارے میں پتا چلا ہے کہ تم اپنے بھائی کو بہت چاہتے ہو؟“ شاہ میر نے کہا۔

طاہر کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی نمودار ہو گئی لیکن دوسرے لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا، پھر وہ بولا۔ ”جی! ہم دونوں کے ماں، باپ، بہت عرصہ پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، افسر علی مجھ سے صرف دو سال بڑا ہے لیکن اس نے پوری سنجیدگی سے باپ جیسی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس نے میرے لیے اتنا کچھ کیا جتنا بعض حالات میں ایک باپ بھی نہ کرے، ظاہر ہے میری جگہ کوئی بھی ہوتا اس سے اتنی ہی محبت کرتا۔“

”تمہاری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ تمہارا بھائی صحت یاب ہو جائے؟“

”جی سر......!“

”اور تمہارے مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ تم اپنے بھائی کو بیرون ملک لے جا کر اس کا علاج کرا سکتے؟“

”جی سر......!“

”اس کے لیے تم ڈبل نوکری کر رہے تھے؟“

”جی......!“

”تمہیں علم تھا کہ افسر علی، سعیدہ کو بے پناہ چاہتا ہے، تم نے ان دونوں کی شادی میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا؟“

”میرا فرض تھا سر!“

”اس کے باوجود اس وقت جبکہ تمہارا بھائی زندگی موت کی کشمکش میں گرفتار تھا، تم نے اپنے چہیتے بھائی کی آبرو پر حملہ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جبکہ تم جانتے تھے کہ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گا؟“

”بس سر! انسان کبھی کبھی شیطان سے بدتر ہو جاتا ہے، مجھ پر جنون طاری ہو گیا تھا، بھٹکنے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے باقی زندگی پشیمانی کے لیے ہوتی ہے، میں نے زندگی بھر کی پشیمانی سے بچنے کے لیے موت کی آغوش میں پناہ لینا مناسب سمجھا۔“

”بہت صفائی سے جھوٹ بول رہے ہو، خود کو بہت چالاک سمجھ رہے ہو، مجھے نہیں جانتے، تمہارے پورے بدن کی کھال اتار کر اس پر نمک لگوا دوں گا، بے وقوف سمجھتے ہو پولیس والوں کو! ہمیں سچ اور جھوٹ کی شناخت آتی ہے، ابھی تم چیخ چیخ کر کہو گے کہ میں سچ بولنا چاہتا ہوں، سمجھے! مجھے چیلنج نہ کرو۔“ شاہ میر کی کیفیت اچانک بدل گئی، اس کی آنکھوں میں خون کی سرخی لہرانے لگی۔ طاہر علی اس کا چہرہ دیکھ کر سہم گیا۔

”آپ ایک مہربان آفیسر ہیں سر! کوئی غلطی ہو گئی ہے، مجھ سے تو معاف فرما دیجیے۔“

”مجھ سے صرف سچ بولو۔“

”جی سر......!“

”تم نے اپنی بھابی کو قتل کیا ہے نہ اس کی عزت لوٹی ہے۔“ شاہ میر کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

طاہر علی گھبرا کر نظریں جھکا کر بولا۔ ”نہیں سر...... میں نے یہ دونوں کام کیے ہیں۔“

”اور تم سچ بول رہے ہو؟“

”جی بالکل سر!“ طاہر علی کے لہجے میں کسی اندرونی خیال کے تحت سختی سی پیدا ہو گئی۔

”افسوس یہی ہے کہ لوگوں نے پولیس کے بارے میں طرح طرح کے افسانے گھڑ لیے ہیں، ہماری مشکلوں پر غور نہیں کیا جاتا، تم سو فیصد موت کے گھاٹ اتر جاؤ، مجھ پر کیا اثر پڑے گا لیکن ہمارا حلف ہوتا ہے کہ ہم سچ اور جھوٹ کی شناخت کریں۔ اب تک تمہارے ساتھ جو اچھا سلوک کیا ہے، وہ میری خاندانی شرافت کا حصہ تھا۔ جزا اور سزا قانون کا حق ہے، اس تھانے میں ہر ملزم کے ساتھ میں یہی سلوک کرتا ہوں لیکن صرف اس وقت تک جب تک وہ مجھے بے وقوف نہ سمجھے، میں تم پر وہ تشدد کروں گا کہ تاریخ کا حصہ بن جائے۔“

”مگر میں تو اقبالی مجرم ہوں، میں ملزم تو نہیں ہوں؟“ طاہر علی نے کہا۔

”تمہاری اس بکواس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں تمہیں آسانی سے پھانسی پر نہیں چڑھنے دوں گا۔ اس سے پہلے میں تمہارے ساتھ جو سلوک کروں گا تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”پھر بتایئے میں کیا کروں؟“

”بس سچ بولو۔“ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس وقت اس کی شخصیت بالکل بدل گئی تھی۔

”آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”تم جانتے ہو ذیشان فاروقی، سعیدہ سے محبت کرتا تھا؟“ شاہ میر نے کسی تمہید کے بغیر کہا اور طاہر علی کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ طاہر علی کا چہرہ یکلخت تاریک ہو گیا تھا۔

”کک... کون... ذی شان...؟“ وہ لڑکھڑاتی زبان میں بولا۔

”جس سے تم نے پانچ لاکھ وصول کیے ہیں۔“

”پپ... پانچ لاکھ......!“

”ہاں! وہ تمہارے اکاؤنٹ میں موجود ہیں، بتاؤ ذیشان ایم کو سے یہ رقم تم نے کس سلسلے میں وصول کی تھی؟“

طاہر علی نے کچھ توقف کیا پھر بولا۔ ”میں نے اپنے جرم کا اعتراف کیا ہے، جس کی سزا صرف موت ہے اور مجھے موت قبول ہے۔ باقی معاملات کیا ہیں، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔“

”سنو......! میں تمہارے بھائی سے بھی مل چکا ہوں، وہ قابلِ رحم ہیں، سوچ لو اگر وہ صحت یاب ہو جائے تو پھر زندگی اس کے لیے کتنی حسین ہو گی جبکہ تم اس کا سہارا بن سکتے ہو، جاؤ میں تمہیں وقت دے رہا ہوں، تمہارا کیس ابھی تحقیقات کی منزل میں ہے، چالان پیش کرنے کے بعد سب کچھ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“ شاہ میر نے کہا۔ پھر سپاہیوں کو بلا کر بولا۔ ”طاہر علی کو واپس لاک اپ کر دو۔“

بظاہر سادہ سی بات تھی لیکن نہ جانے کیوں شاہ میر کے دل میں ایک خیال الجھا ہوا تھا۔ کچھ ہے، کوئی ایسی بات ضرور ہے جو دل کو یہ تسلیم نہیں کرنے دے رہی کہ طاہر، سعیدہ کا قاتل ہے۔ وہ سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

سب انسپکٹر صفورا بھی اس کیس میں پوری دلچسپی لے رہی تھی بلکہ ذیشان فاروقی اس کی دریافت تھا جو اب اس کیس میں ایک اہم کردار بن گیا تھا لیکن ابھی ان لوگوں نے اسے ٹچ نہیں کیا تھا، بس شاہ میر نے زمان شاہ کو اس کی نگرانی پر لگا دیا تھا۔

پھر اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ صفورا کو طاہر علی کے گھر سے ایک پاس بک ملی تھی جس سے ذیشان کا نام سامنے آیا تھا۔ کیوں نہ ایک بار پھر اس گھر کی تلاشی لی جائے۔ وہ گھر اس جرم کا مرکز تھا، وہاں سے اب پہرہ ہٹا لیا گیا تھا چنانچہ وہ تیاریاں کر کے سادہ لباس میں طاہر علی کے گھر پہنچ گیا۔ مین دروازے پر بدستور سیل لگی ہوئی تھی۔ اندر جانے کے لیے اس نے ایک دیوار منتخب کی اور اندر پہنچ گیا۔

مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک پراسرار ہیبت پورے مکان پر طاری تھی۔ شاہ میر کے پاس ٹارچ موجود تھی۔ ابھی وہ ٹارچ جلانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک چٹ کی آواز ہوئی اور ایک کمرے میں روشنی ہو گئی۔ شاہ میر اچھل پڑا تھا۔ اس کے پورے بدن میں لہریں دوڑنے لگی تھیں۔ یہاں اس ویران گھر میں کون آ سکتا ہے؟

اس کی تمام پوشیدہ قوتیں بیدار ہو گئیں۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے ذہن میں جو الجھن تھی، وہ رنگ لا رہی ہے۔ بظاہر یہ سادہ سا کیس رنگ بدل رہا ہے۔ کون ہے جو اس گھر میں داخل ہوا ہے۔ اس نے جلدی سے ماسک نکال کر چہرے پر لگا لی، پھر وہ بلی جیسے بے آواز قدموں سے روشن کمرے کی طرف بڑھا۔ کمرے کے دروازے کے پاس رک کر اس نے اندر کی سن گن لی، پھر دروازے پر انگلی رکھ کر اسے تھوڑا سا اندر دبایا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ دروازہ اندر سے بند نہیں ہے لیکن اندر کی کیفیت کا اندازہ لگائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ اس نے دروازے سے کان لگا دیئے۔ کوئی دبے قدموں اندر چل رہا تھا، پھر کسی الماری کے کھلنے کی آواز سنائی دی۔ شاہ میر نے جھک کر ’کی ہول‘ سے آنکھ لگا دی۔ وہ شخصیت تو سامنے نہیں آ سکی، بس اس کے پاؤں نظر آ رہے تھے جو کسی ایک ہی آدمی کے تھے۔

شاہ میر چند لمحے ’کی ہول‘ سے آنکھ لگائے رہا۔ اسے بس چلتے پھرتے پاؤں نظر آ رہے تھے۔ اندر جو کوئی بھی تھا، کسی چیز کی تلاش میں تھا۔ شاہ میر نے آخر کار عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر اس نے دروازے کو زور سے دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر چونکہ تیز روشنی تھی اس لیے اس نے آسانی سے اندر موجود شخص کا چہرہ دیکھ لیا اور اس نے جو کچھ دیکھا، اس نے دماغ کو چکرا کر رکھ دیا۔ ایک ناممکن بات تھی، ایسی کہ کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود یقین نہ آئے۔

یہ افسر علی تھا، طاہر علی کا بھائی افسر علی، کینسر کا مریض، زندگی کی آخری سانسیں گنتا ہوا افسر علی...... جس کا بھائی اس کی زندگی کے لیے نہ جانے کیا سے کیا کر چکا تھا۔

اس ذہنی جھٹکے نے شاہ میر کو ایک لمحے کے لیے معطل کر دیا تھا اور افسر علی اس موقع سے فائدہ اٹھا گیا۔ شاہ میر کو اس کھڑکی کا پتا نہیں تھا جو کمرے کے عقب میں تھی اور اس میں سلاخیں نہیں تھیں۔ افسر علی نے برق رفتاری سے چھلانگ لگائی اور کھڑکی سے دوسری طرف کود گیا۔

اس کی پھرتی قابل دید تھی۔ اگر کسی نے اسے اسپتال کے بستر پر دیکھا تھا تو وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہ قریب المرگ شخص بستر سے اٹھ کر چار قدم بھی چل سکتا ہے۔

دوسرے لمحے شاہ میر نے سنبھل کر کھڑکی کی طرف دوڑ لگائی اور باہر جھانکا لیکن باہر خاموش سناٹا چیخ رہا تھا۔

شاہ میر دیر تک سناٹے میں جھانکتا رہا۔ یہ کیا قصہ ہے۔ اس نے جو چہرہ دیکھا، وہ افسر علی ہی کا چہرہ تھا۔ کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی، کیونکہ افسر علی کے بدن پر اسپتال کا لباس ہی تھا۔ شاہ میر نے گردن جھٹکی، پھر گہری سانس لے کر کمرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے اس کمرے کے علاوہ بھی پورے گھر کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن اسے کچھ نہیں ملا تھا۔ افسر علی کیا تلاش کرنے آیا تھا، کیا وہ کینسر کا مریض نہیں تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسپتال میں اسے بلاوجہ ہی داخل نہیں کیا گیا ہو گا۔

آخر کار وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ گھر پہنچنے کے بعد بھی اس کے ذہن میں ریل چلنے لگی۔ یہ تو صورت حال ہی بدل گئی تھی۔ اس سے ایک نتیجہ اور اخذ کیا جا سکتا ہے، ممکن ہے افسر علی خود ہی سعیدہ کا قاتل ہو، ممکن ہے اسے سعیدہ کے کردار پر شبہ ہو۔ افسر علی کے مالی حالات بس مناسب ہی تھے جبکہ ذیشان فاروقی کروڑ پتی بن چکا تھا۔ ممکن ہے سعیدہ کا ذہن بھٹکا ہو، ممکن ہے اس نے کسی جھگڑے میں افسر علی سے کہا ہو کہ اس نے ایک کروڑ پتی شخص کو چھوڑ کر اس سے شادی کرنے کی غلطی کی ہے۔ ایک بیمار آدمی سے جو کسی بھی وقت مر سکتا ہے اور افسر علی نے مشتعل ہو کر سعیدہ کو قتل کر دیا ہو، پھر جب طاہر علی کو علم ہوا تو اس محبت کرنے والے بھائی نے اپنے بھائی کو بچانے کے لیے خود محبت کی صلیب پر مصلوب ہونے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ لیکن پھر وہ چیک......؟ ہو سکتا ہے چالاک افسر علی نے کسی طرح وہ چیک وصول کر کے طاہر علی کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا ہو لیکن کیوں......؟ آخر یہ کھیل کیا ہے، پھر شاہ میر نے سوچا کہ اسے دیکھ کر افسر علی پر کیا ردعمل ہوا ہو گا۔ شاہ میر کے چہرے پر بے شک نقاب تھی لیکن اس کا ذہن پولیس ہی کی طرف جا سکتا ہے اور اب ممکن ہے وہ اسپتال سے غائب ہی ہو جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی قابل غور بات تھی کہ وہ کینسر کا مریض ہے بھی یا نہیں......! اور اگر نہیں ہے تو ڈاکٹروں نے اسے کینسر کا مریض کیوں ظاہر کیا ہے۔

کیس مزید الجھ گیا تھا۔ بظاہر ایک شخص نے خود کو اپنی بھابی کا قاتل ظاہر کر کے خود کو قانون کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے خود کو ایک بدکردار قاتل ظاہر کر کے موت قبول کر لی تھی۔ تھوڑی سی رسمی کارروائی کر کے اسے موت کی سزا دلوائی جا سکتی تھی لیکن کیس شاہ میر جیسے پولیس آفیسر کے علاقے میں ہوا تھا اور شاہ میر بال سے کھال نکالنے کا ماہر تھا، چنانچہ کیس کی نوعیت ہی بدلتی جا رہی تھی۔ اس نے کچھ فیصلے کیے اور باقی کام دوسرے دن کے لیے چھوڑ دیئے۔

دوسرے دن آفس کے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر اس نے زمان شاہ کو ساتھ لیا اور اسپتال پہنچ گیا۔ اس نے وہاں ایم۔ ایس سے ملاقات کی جس نے اسے بڑے احترام سے ویلکم کہا تھا۔

”قتل کے ایک کیس میں مجھے پوری رازداری کے ساتھ کچھ انفارمیشن چاہیے ڈاکٹر صاحب!“

”میں حاضر ہوں، فرمایئے؟“ ایم۔ ایس نے خوش اخلاقی سے کہا۔

”مجھے افسر علی نامی ایک مریض کے بارے میں تفصیلات درکار ہیں جو کینسر وارڈ میں ہوتا ہے۔“

”بہتر...... میں ابھی متعلقہ ڈاکٹروں سے رجوع کرتا ہوں۔“ ایم۔ ایس نے متعلقہ اسٹاف سے رجوع کر کے افسر علی کی فائل منگوالی۔ شاہ میر ان رپورٹوں کو دیکھنے لگا۔ ایم۔ ایس ان کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ ان تفصیلات کے مطابق افسر علی کینسر کا خطرناک مریض تھا۔ شاہ میر نے خصوصی طور پر ڈاکٹر سے سوال کیا کہ کیا ایسے کسی مریض کی جسمانی قوتیں بحال رہتی ہیں؟

”اس کا تعلق مریض کی ول پاور پر ہے، وہ کوئی جسمانی مشقت سے تھک تو جاتا ہے لیکن اگر وہ چاہے تو کوئی مشقت کر بھی سکتا ہے، کیا آپ کوئی خاص اشارہ کرنا چاہتے ہیں؟“

”ہاں! ایک آخری سوال ڈاکٹر صاحب! کیا اس حالت کا مریض آپ کے کلینک سے کچھ دیر کے لیے باہر نکل کر جا سکتا ہے؟“

ایم۔ ایس نے کچھ دیر سوچا، پھر بولا۔ ”ہاں! ایسا مجرمانہ عمل کوئی کر سکتا ہے، آپ کو علم ہے کہ آج کل کون اپنی ذمہ داری پوری کرتا ہے، کیا افسر علی کو کہیں باہر دیکھا گیا ہے؟“

”جی......!“

”سوری! آپ مجھے حکم دیں، ان کی انکوائری کروں؟“

”نہیں......! یہ میرے اور آپ کے درمیان کی بات ہے، اسے شک کا موقع نہ دیں، نہ اسے پولیس کی کسی انکوائری کے بارے میں بتائیں۔“

”بہت بہتر!“ ایم۔ ایس نے جواب دیا۔

☆......☆......☆

ذیشان فاروقی کی ملاقات جرمنی میں شاہد علی سے ہوئی تھی۔ شاہد علی، بہت بڑے بزنس مین تھے اور بزنس کے سلسلے میں جرمنی آئے ہوئے تھے جبکہ ذیشان فاروقی بینک کی طرف سے ایک مختصر کورس کے لیے جرمنی گیا تھا۔ بینک نے ذیشان کے لیے جرمنی کے ایک شاندار ہوٹل میں قیام کا بندوبست کیا تھا اور شاہد علی بھی اسی ہوٹل میں اس کے سامنے والے کمرے میں مقیم تھے۔ ہم وطن ہونے کی حیثیت سے دونوں کی ہیلو ہائے ہوئی اور اس کے بعد اتفاق سے شاہد علی کا ایک ایسا مسئلہ نکل آیا جو ذیشان فاروقی کے ذریعے حل ہو گیا۔ معاملہ کروڑوں کے نقصان کا تھا۔ ذیشان نے اپنی مہارت سے اسے حل کیا تھا۔ شاہد علی اس کے گرویدہ ہو گئے اور یہ پسندیدگی اتنی بڑھی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی شاردا سے اس کی شادی کے بارے میں سوچنے لگے۔ انہوں نے ذیشان کے بارے میں مزید معلومات کیں اور وطن واپس آ کر اپنے اہل خاندان سے اس بارے میں مشورے کیے اور پھر چند ہی روز کے بعد دوبارہ جرمنی پہنچ گئے۔ اس بار وہ اپنی بیٹی شاردا کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ ذیشان ابھی جرمنی میں ہی تھا۔ انہوں نے ذیشان سے شاردا کا تعارف کرایا۔ شاردا اچھی شکل وصورت کی لڑکی تھی لیکن بے انتہا بگڑی ہوئی، بے حد موڈی اور آتش مزاج......! اکلوتی ہونے کی وجہ سے اس کے سارے لاڈ اٹھائے جاتے تھے۔ وہ عیش وعشرت کی رسیا تھی اور ہر شخص پر حکم چلانے کی عادی تھی لیکن ذیشان اسے پسند آ گیا تھا، چنانچہ شاہد علی نے ان دونوں کو خوب کھل کھیلنے کا موقع دیا اور شاردا نے ذیشان کو آخر کار اپنی طرف متوجہ کر ہی لیا۔

ذیشان مایوسِ محبت تھا۔ کالج میں اس نے سعیدہ کو دل سے چاہا تھا لیکن سعیدہ، افسر علی کو پیار کرتی تھی، چنانچہ وہ خاموشی سے ان کے راستے سے ہٹ گیا۔ پھر زندگی اس کے لیے بے کیف ہو گئی تھی لیکن شاردا نے اسے اپنی اداؤں سے گھیر لیا اور وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے اپنے اور شاردا کے مالی فرق کا اندازہ تھا لیکن شاردا نے اسے انڈیکیشن دی کہ اگر وہ چاہے تو آسانی سے اسے ساری زندگی کے لیے اپنا سکتی ہے۔ اس کی تصدیق شاہد علی نے کر دی۔ انہوں نے بات شاردا پر رکھی کہ وہ ذیشان کو پسند کرتی ہے اور وہ ان کی اکلوتی بیٹی ہے، اس لیے وہ اس کی خوشی کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ شاردا سے شادی کے بعد وہ اسے اس کی اپنی فرم کھلوا دیں گے۔

ذیشان نے سوچا کہ کیا حرج ہے۔ تقدیر اس طرح بدل رہی ہے تو اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس نے آمادگی کا اظہار کر دیا اور جرمنی میں ہی ان دونوں کا نکاح کر دیا گیا۔ وہ میاں، بیوی کی حیثیت سے وطن واپس آئے۔ یہاں آ کر ذیشان فاروقی نے بینک کی نوکری چھوڑ دی اور بینک کے واجبات ادا کر دیئے پھر ذیشان ایم کو وجود میں آ گئی۔

ابتدا کے چند روز بھی بہتر نہیں گزرے۔ شاردا نے شادی کے فوراً بعد ہی چولا بدل لیا اور اپنے اصل روپ میں آ گئی جس پر ذیشان حیران رہ گیا۔ وہ کھانے پینے کی بہت شوقین تھی۔ شادی سے پہلے اس نے اپنے فگر کا کچھ خیال رکھا تھا لیکن شادی کے بعد موٹی ہونے لگی۔ انتہائی بدمزاج اور بدتمیز تھی۔ ذیشان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ کافی دن پریشان رہا، پھر اس نے عقلمندی سے سوچا کہ اسے جو حیثیت حاصل ہو گئی ہے، وہ عمر بھر کی محنت سے نہیں حاصل ہو سکتی تھی اور بس جواب میں ایک بدمزاج عورت کو برداشت کرنا تھا، چنانچہ اس نے سمجھوتہ کر لیا۔ گزرتے ہوئے شب وروز کے ساتھ شاردا کی بدمزاجی اور جسامت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ ایک موٹی تازی عورت نظر آنے لگی جبکہ ذیشان خود اسمارٹ اور خوبصورت ہوتا گیا۔

شاردا کو شک کرنے کی بری عادت بھی تھی جس کی وجہ سے بہت سے واقعات پیش آ چکے تھے۔ ذیشان فطری شرافت سے مجبور ہو کر کسی بات کو آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا لیکن پھر کچھ ایسے لمحات آ گئے جن پر اسے بے بسی کا احساس ہونے لگا۔ اب تک اس نے سب کچھ برداشت کیا تھا جس کی وجہ سے شاردا بگڑتی چلی گئی۔ اب وہ ایک خونخوار عورت بن چکی تھی۔ غصے میں آتی تو جو کچھ ہاتھ میں آتا، ذیشان کو دے مارتی۔ ذیشان کشمکش میں پڑ گیا کہ کیا کرے، البتہ پھر ایک ایسی مشکل آ گئی جس نے ذیشان کو پست کر دیا۔ یہ وہ خطوط تھے جو کبھی ذیشان نے سعیدہ کو لکھے تھے۔ ان خطوط میں اس نے سعیدہ سے اپنی چاہت کی بھیک مانگی تھی۔ اسے لکھا تھا کہ اگر وہ اسے نہ ملی تو وہ خودکشی کر لے گا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کے بعد وہ کسی لڑکی سے پیار نہیں کرے گا اور اگر اس نے کسی سے شادی کی تو وہ شادی نہیں مجبوری ہو گی اور مجبوری سے عشق نہیں کیا جاتا۔ مزید کچھ اس طرح کی باتیں تھیں کہ اگر شاردا کو معلوم ہو جاتیں تو وہ اس کی گردن ہی اڑا دیتی۔ یہ خطوط فوٹو اسٹیٹ کر کے بھجوائے گئے تھے۔

ذیشان وحشت زدہ ہو گیا۔ اس سے پانچ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ذیشان نے فوراً پانچ لاکھ کی ادائیگی کر دی لیکن اسے یقین تھا کہ یہ صرف ایڈوانس ہے، بلیک میلر بہت جلد دوسرا مطالبہ کرے گا اور اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ اس سے ایک کروڑ کی رقم طلب کی گئی تھی۔ ذیشان کو چکر آ گئے۔ بلیک میلر کے فون آتے رہے۔

ایک دن ذیشان نے جھلا کر کہا۔ ”تم انتہائی بے غیرت اور ذلیل انسان ہو، میں نے تمہیں پانچ لاکھ ادا کر دیئے، اب میں تمہیں ایک روپیہ بھی نہیں دوں گا، تم زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے ہو، یہی کہ میری ازدواجی زندگی تباہ کر دو، ٹھیک ہے میری بیوی بے حد سخت مزاج ہے، میں اس سے کہہ دوں گا کہ یہ میری نوجوانی کی غلطی تھی، اس پر بھی بات نہ بنی تو میں اسے طلاق دے دوں گا۔ سنو میں تمہیں مزید پانچ لاکھ اور دے سکتا ہوں، بس اس سے زیادہ ایک روپیہ نہیں۔“

”سوچ لیں ذیشان صاحب! میرے بھی مستقبل کا سوال ہے، آپ نہ مانے تو آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میرا اگلا قدم کیا ہو گا، یہ خطوط کہیں اور بھی پہنچائے جا سکتے ہیں۔“

”تمہارا جو دل چاہے کرو۔“ ذیشان نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

لیکن اسے احساس تھا کہ بات اتنی معمولی نہیں ہے، ضرور کوئی بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ شاردا کے علاوہ اس کی زندگی میں اس نئے بھونچال کا آغاز ہو گیا تھا۔

(جاری ہے)

اقرارِ جرم

ایم اے راحت

آخری قسط

ذیشان کے دل میں خوف کا بسیرا ہو گیا تھا جسے شاردا نے فوراً محسوس کر لیا۔ ''خیر تو ہے، یہ راتوں کی نیندیں کیوں اڑ گئی ہیں، کوئی من میں آ بسی ہے؟''

''ایسا ہی سمجھو۔'' ذیشان نے بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کی۔

''بس اتنی ہی عمر لکھی تھی تمہاری! مجھے جانتے ہو؟''

''تم ہی تو ہو جو میرے من میں بسی ہو۔''

''پیارے ذیشان......! میں نے بھی کالج میں بہت وقت گزارا ہے، ہر طرح کی اونچ نیچ دیکھی ہے، مجھ سے اڑنا آسان نہیں ہے، کالج میں رہ کر بھی میں نے اپنی ذات سے کوئی اسکینڈل نہیں لپیٹا لیکن جانتی سب ہوں اور تم آسانی سے مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔''

''مطلب......؟'' ذیشان نے پوچھا۔

''کون ہے وہ ناشدنی جس کی موت میرے ہاتھوں آئی ہے؟''

''محترمہ......! آپ تحقیقات ضرور کیجیے اور اس ناشدنی کو ضرور قتل فرما دیجیے، میں صرف کاروباری الجھنوں میں ہوں۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟''

''تمہاری قسم!''

''خبردار......! دوبارہ میری قسم کبھی نہ کھانا، مرد کبھی بیوی کی سچی قسم نہیں کھا سکتا۔''

''ٹھیک ہے، آپ کو اختیار ہے جس طرح چاہیں تحقیق کریں۔'' ذیشان نے بے بسی سے کہا۔ لیکن صورتحال کی سنگینی کا احساس اور شدید ہو گیا تھا۔ اگر بلیک میلر نے شاردا سے رابطہ کر لیا تو میری موت شاردا ہی کے ہاتھوں ہوگی۔ شاردا مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ ذیشان نے سوچا۔

☆......☆......☆

صفورا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ بے یقینی کے انداز میں شاہ میر کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ کچھ دیر وہ کچھ نہ بولی۔ پھر کہنے لگی۔ ''تو کیا اسے کینسر نہیں ہے؟''

''ہے۔ لیکن اس کے باوجود......!'' شاہ میر اسے ایم۔ ایس سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔ پھر بولا۔ ''اچھی خاصی ذہنی ورزش ہو رہی ہے، ذیشان کے بارے میں بھی اب ذرا دوسرے انداز میں سوچنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے، اس کا کردار کیا ہے؟''

''سب کچھ ہی عجیب ہے، طاہر علی اپنی بھابی کے قاتل کی حیثیت سے خود کو پولیس کے سامنے پیش کرتا ہے، یہ جان کر بھی کہ اسے قتل کے جرم میں سزائے موت ہوگی۔ اس کے علاوہ بھابی کے ساتھ برے عمل کا اعتراف بھی کرتا ہے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ اس کی تصدیق کرتی ہے لیکن افسر علی کا اسپتال سے اٹھ کر اپنے گھر آنا اور کچھ تلاش کرنا، کچھ نئی کہانیوں کو جنم دیتا ہے اور اس سے طاہر علی کی یہ پیشکش مشکوک ہو جاتی ہے۔''

''بالکل ٹھیک......!''

''وقوعے والی رات بھی افسر علی اچانک اپنی بیوی سے ملنے اپنے گھر آ سکتا ہے لیکن وہاں وہ اپنی بیوی کو ذیشان کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھتا ہے اور شدتِ غضب سے دیوانہ ہو کر اپنی بیوی کو قتل کر دیتا ہے لیکن اپنے بھائی سے بے پناہ پیار کرنے والا طاہر علی بھائی کی زندگی بچانے کے لیے سارا الزام اپنے سر لے لیتا ہے۔''

''سب کچھ ہو سکتا ہے، ضرورت پڑی تو ڈی این اے اپلائی کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے پہلے ہمیں ذیشان فاروقی سے ملنا ہوگا۔''

''لیکن سر......! ایک امر لازمی ہے، وہ یہ کہ قاتل انہی تینوں میں سے کوئی ہے۔'' صفورا نے کہا اور شاہ میر مسکرا دیا۔

☆......☆......☆

شاہ میر اور صفورا سادہ لباس میں ذیشان کے آفس پہنچے تھے۔ شاہ میر نے پولیس کارڈ دکھایا۔ ایک نگاہ میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ ذیشان ایک الجھا ہوا انسان ہے۔ یہ جان کر کہ ان دونوں کا تعلق پولیس سے ہے، اس نے زہرخند سے کہا۔ ''تو شاردا نے آپ لوگوں سے مدد لی ہے، ٹھیک ہے آپ اپنا فرض ادا کیجیے لیکن میں اب ہر مشکل سے گزرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں، میں پھر اپنی پرانی زندگی میں واپس چلا جاؤں گا، یہ عیش و عشرت مجھے راس نہیں آئے۔''

''ہماری تحقیقات نے آپ کے ماضی کی تفصیل ہمارے سامنے پیش کر دی ہے، لیکن اس وقت میں ایک ہمدرد کی حیثیت سے آپ کے پاس آیا ہوں اور آپ کو ہدایت کرتا ہوں کہ مجھے وہ ساری تفصیل بتا دیجیے جو آپ کو پھانسی کے پھندے سے بچا سکے ورنہ دوسری صورت میں......!''

''جی......!'' ذیشان نے حیرت سے انہیں دیکھا پھر سرسراتی آواز میں بولا۔ ''پھانسی کے پھندے سے!''

''ہاں......!'' شاہ میر نے کہا۔

''تھوڑا بہت پڑھا لکھا میں بھی ہوں انسپکٹر صاحب۔ کیا میاں، بیوی کا اختلاف بھی پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا ہے، اس کے لیے تو کسی کو قتل کرنا ضروری ہوتا ہے جو میں نے ابھی تک نہیں کیا ہے، نہ ہی میرے اندر اتنی ہمت ہے کہ شاردا کو قتل کر دوں، نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔''

''بات شاردا کے قتل کی نہیں ہے۔''

''جی......!''

''تھوڑی سی تفصیل آپ کو بتانا ضروری ہے مثلاً آپ کا ماضی......!'' شاہ میر نے اپنی تحقیق کے مطابق ذیشان کا پورا ماضی کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

ذیشان دم بخود رہ گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہ میر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آفیسر! پولیس کو میرے بارے میں اتنی تحقیقات کی ضرورت کیوں پیش آ گئی، شاردا نے......!''

''آپ ہمارے سوالات کے جواب دیں مسٹر ذیشان......! یہ قیاس آرائیاں بعد میں کر لیجیے گا، سعیدہ نے افسر علی سے شادی کر لی کیونکہ وہ افسر علی سے محبت کرتی تھی، وقت گزر گیا، آپ باہر چلے گئے اور اس کے بعد آپ کی شادی شاردا سے ہو گئی، آپ اپنی بیوی کے مزاج سے پریشان ہو گئے اور آپ نے کسی انتقامی جذبے سے مغلوب ہو کر سعیدہ کو قتل کر دیا، لیکن......!''

ذیشان اس طرح شاہ میر کو دیکھنے لگا جیسے اپنے کانوں پر یقین کر رہا ہو کہ شاہ میر نے جو کچھ کہا ہے، اس نے وہی سنا ہے یا اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے پُراضطراب لہجے میں کہا۔

''کیا......کیا کہا آپ نے آفیسر......؟''

''آپ نے سعیدہ کو کیوں قتل کیا؟''

''سعیدہ......قتل!'' ذیشان کے چہرے پر شدید ہیجان نمودار ہو گیا۔ ''آپ سچ کہہ رہے ہیں آفیسر! سعیدہ قتل ہو گئی؟'' پھر وہ ایک دم غصے میں آ گیا۔ ''یہ کیا کھیل، کھیل رہے ہیں آپ، شاردا نے آپ کو کیا الٹی سیدھی کہانیاں سنائی ہیں۔''

''آپ بہت اچھی اداکاری کر رہے ہیں۔'' شاہ میر نے کہا۔ اس دوران صفورا کی نظریں ایک لمحے کے لیے ذیشان کے چہرے سے نہیں ہٹی تھیں۔ وہ تجربے کی آنکھ سے ذیشان کے ذہن کی گہرائیوں میں جھانک رہی تھی۔

''نہیں! خدا کے لیے نہیں......! اس سے اب میرا کوئی رابطہ نہیں ہے لیکن میں اس سے اب بھی محبت کرتا ہوں، خدا کرے آپ جھوٹ بول رہے ہوں...... خدا کرے وہ زندہ ہو، سلامت ہو...... ہر چیز اپنی ملکیت تو نہیں ہوتی، خدا کرے، خدا کرے۔'' وہ حسرت سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

''آپ اس سے اس قدر ناواقف نہیں رہے ذیشان صاحب! خیر......اسے قتل کر دیا گیا ہے اور آپ ضرور حیران ہوں گے کہ ایک شخص نے اس کے قتل کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔''

''پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' وہ پست لہجے میں بولا۔

''جس شخص نے اس کے قتل کا اعتراف کیا ہے، وہ افسر علی کا بھائی طاہر علی ہے جسے......!'' شاہ میر نے الفاظ چبا چبا کر کہا۔ ''جسے آپ نے پانچ لاکھ روپے بذریعہ چیک ادا کیے ہیں۔''

ذیشان کا چہرہ ایکدم تاریک ہو گیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کے ساتھ خوف بھی ابھر آیا تھا، پھر اس کی ڈوبتی آواز ابھری۔ ''میرا برا وقت آ گیا ہے انسپکٹر صاحب! کیا آپ مجھے قاتل سمجھ رہے ہیں، کیا آپ کا خیال ہے کہ میں نے طاہر علی کو پانچ لاکھ روپے دے کر سعیدہ کو قتل کر دیا ہے؟''

''آپ کو علم ہے کہ افسر علی کو کینسر ہو گیا ہے اور وہ اسپتال میں زندگی موت کی گھڑیاں گن رہا ہے؟''

''میں......میں آپ کو کیا بتاؤں انسپکٹر صاحب! میری زندگی بڑی بدنصیبی کا شکار رہی ہے، میں نے سعیدہ سے سچی محبت کی ہے اور اب بھی کرتا ہوں، میں اسے زندگی سے محروم کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، اس سے قطع تعلق ہونے کے بعد میں نے ایک شریف انسان کی طرح اس کا راستہ چھوڑ دیا، کالج میں پڑھنے کے دوران میں نے اسے کچھ خطوط لکھے تھے جن میں محبت کا اظہار اور کچھ ایسی باتیں تھیں جو قابلِ اعتراض تھیں، میں نے اسے دھمکیاں بھی دی تھیں، جن میں لکھا تھا کہ اگر اس نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں اسے قتل کر کے خودکشی کر لوں گا، ایسی بہت سی جذباتی باتیں......! اس کی شادی ہو گئی، میں نے نوکری کر لی اور پھر ملک سے باہر چلا گیا، وہاں مجھے شاہد علی صاحب ملے اور انہوں نے مختلف عوامل سے گزر کر مجھے اپنی بیٹی سے شادی کرنے کی پیشکش کی، میں نے یہ سوچ کر شادی کر لی کہ زندگی تو گزارنی ہے، بعد میں مجھے شاردا کے مزاج کا علم ہوا جو میرے لیے، بہت تکلیف دہ تھا، وہ بے حد شکی مزاج اور بگڑی ہوئی لڑکی نکلی، میں نے بساط بھر خاموشی اختیار کی، افسر علی کو میرے بارے میں سب کچھ علم ہو گیا، وہ ایک موذی مرض میں گرفتار ہو گیا تھا اور شاید زندگی سے مایوس ہو کر اذیت پسندی پر اتر آیا تھا، وہ خطوط اس کے ہاتھ لگ گئے جو میں نے سعیدہ کو لکھے تھے، اس نے مجھے فون کر کے ان خطوط کے بارے میں بتایا اور کہا کہ یہ خطوط وہ شاردا کو بھیج دے گا، شاردا ایک جنونی عورت ہے، میں جانتا تھا کہ اگر خطوط اسے مل گئے تو وہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتی ہے، اس نے مجھے ان خطوط کی فوٹو کاپیاں بھجوا کر شدید خوف زدہ کر دیا، میں نے اس کے مطالبے پر اسے پانچ لاکھ کا چیک بھجوا دیا، میں سادہ سا انسان ہوں، آسانی سے اس کے جال میں پھنس گیا لیکن افسر علی نے مجھ سے پانچ لاکھ مانگ کر تجربہ کیا تھا کہ میں اسے پیسے دے سکتا ہوں کہ نہیں! پھر اس نے اپنا اصل مطالبہ کر دیا یعنی ایک کروڑ، پورے ایک کروڑ......! یہ دولت جو میرے پاس ہے، وہ میری اپنی نہیں ہے، شاہد علی صاحب نے مجھے ہر سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا ہے لیکن میں محتاط انسان ہوں، میں نے سختی سے اسے انکار کر دیا، وہ مجھے دھمکیاں دیتا رہا لیکن میں نے صاف کہہ دیا کہ اس کا جو دل چاہے کرے، میں اسے کچھ نہیں دوں گا لیکن سعیدہ کا قتل......! آپ کو میں بتا رہا ہوں انسپکٹر صاحب، میں بہت بزدل انسان ہوں، اگر تقدیر مجھے زندگی سے محروم کرنا چاہتی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں، آپ مناسب سمجھیں تو انصاف کے نام پر میری بے گناہی کی تصدیق کر لیں۔''

''ہم ضرور تصدیق کریں گے لیکن آپ کو ہم سے تعاون کرنا ہوگا۔''

''میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔''

''آپ کسی بھی وقت ہمیں ان خطوط کی فوٹو اسٹیٹ دکھا دیں۔'' شاہ میر نے کہا۔

ذیشان سوچ میں ڈوب گیا، پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں وہ خطوط آپ کو اسی وقت دکھا سکتا ہوں، ظاہر ہے میں انہیں گھر میں رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر اس نے ایک الماری کی خفیہ دراز سے خطوط کی فائل نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔ صفورا اور شاہ میر ان خطوط کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے رہے۔ کافی دیر گزر گئی، پھر شاہ میر نے تمام خطوط سمیٹ کر انہیں ذیشان کے حوالے کر دیے۔

''شکریہ ذیشان صاحب! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سازش افسر علی نے کی ہے تو طاہر نے خود کو سعیدہ کے قاتل کی حیثیت سے کیوں پیش کیا، آپ کو ایک تکلیف دہ خبر اور سناؤں، قتل سے پہلے سعیدہ کے ساتھ زیادتی بھی کی گئی جبکہ اس کا شوہر اسپتال میں تھا۔''

''طاہر......! وہ...... میں نہیں کہہ سکتا کیا ہوا ہے، یہ بھی افسر علی کی کوئی چال ہو سکتی ہے، اوہ! کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا ہے، یہ بہت گہری چال ہو سکتی ہے انسپکٹر صاحب۔ اسے اندازہ ہے کہ کینسر اسے زندہ نہیں رہنے دے گا اور اس کی موت کے بعد ممکن ہے سعیدہ میری طرف مائل ہو جائے، آپ نے ان خطوط سے اندازہ لگایا ہوگا کہ سعیدہ کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ ضرور تھا لیکن وہ افسر سے محبت کرتی تھی، ہاں اس کی موت کے بعد شاید اسے میرا خیال آ جاتا...... آہ شاید موت کے خوف نے اسے جنونی بنا دیا تھا، اس نے جنون کے عالم میں یہ اقدامات کیے ہوں۔ جو کچھ بھی ہے انسپکٹر صاحب! خدا کے لیے آپ پوری باریک بینی سے تفتیش کیجیے، اگر میری تقدیر میں بے گناہی کی موت لکھی ہے تو دوسری بات ہے ورنہ میں بے گناہ ہوں۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو، اس تعاون کا بے حد شکریہ۔ اجازت!''

ہیڈ آفس آنے تک شاہ میر نے صفورا سے کوئی بات نہیں کی لیکن آفس آ کر چائے پیتے ہوئے اس نے کہا۔ ''آپ بڑی گہری نظروں سے ذیشان کو دیکھ رہی تھیں مس صفورا! ویسے کافی خوبصورت آدمی ہے۔''

''آپ سے زیادہ نہیں!'' صفورا مسکرا کر بولی۔

''وہ تو میں جانتا ہوں، خیر کیا اندازہ لگایا آپ نے......؟''

''ویسے تو کوئی بات حتمی طور پر نہیں کی جا سکتی لیکن اس کا ہر تاثر سچا لگا تھا، میرا تجربہ ہے کہ اس نے ہم سے جھوٹ نہیں بولا۔''

''اس نے جو چیک بھیجا، وہ طاہر کے اکاؤنٹ میں جمع ہوا، جبکہ ذیشان کا کہنا ہے کہ اس سے افسر علی نے رابطہ کیا اور افسر علی کو میں نے جس عالم میں دیکھا، تمہیں بتا چکا ہوں۔''

''ایک بات کہوں سر......! ہو سکتا ہے یہ دونوں بھائیوں کے درمیان ایثار کا معاملہ ہو، جیسا کہ پتا چل چکا ہے کہ طاہر علی اپنے بھائی کو بے پناہ چاہتا ہے، اپنی زندگی سے مایوس ہو کر افسر علی اپنے بھائی کا مستقبل بنانا چاہتا ہو، اس نے ذیشان سے رقم حاصل کرنے کے بارے میں سوچا اور......!''

''نہیں صفورا! پھر سعیدہ کا قتل اور اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کس خانے میں فٹ کرو گی؟''

ایک بار پھر انہیں طاہر علی سے ایک خصوصی نشست کرنی پڑی۔ طاہر علی کافی لاغر نظر آ رہا تھا۔

''مسٹر طاہر علی! ہم اس دوران کام کرتے رہے ہیں۔ لیکن آپ کے کیس میں کوئی اور خاص بات نہیں معلوم ہو سکی، اب آپ کو سعیدہ افسر علی کے قاتل کی حیثیت سے عدالت کے سامنے پیش کرنا ہے، چالان پیش کرنے کے لیے آپ کے اقبالی بیان کی ضرورت ہے۔''

معمول کے مطابق صفورا ایک ماہر فیس ریڈر کے طور پر طاہر علی کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے صاف محسوس کیا کہ طاہر علی کا چہرہ پیلا پڑ گیا، اس کے بدن پر ہلکی سی کپکپی طاری ہو گئی۔

''عدالت آپ کو موت کی سزا دینے کے علاوہ اور کوئی فیصلہ نہیں کرے گی، آپ کے اقبالی بیان کے بعد ہی میں چالان پیش کروں گا، چنانچہ اب میں آپ سے آخری بیان لے رہا ہوں تاکہ عدالت میں آپ کا چالان پیش کر دوں۔''

طاہر علی نے بے بسی کے انداز میں شاہ میر کو دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔ ''میں کیا کہوں، سوائے اس کے کہ اپنے بھائی پر اپنی زندگی قربان کر دوں۔''

''کیا مطلب......؟'' شاہ میر نے چونک کر پوچھا۔

لیکن طاہر علی گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے، پھر اس نے رندھی آواز میں کہا۔ ''میرا بھائی زندگی موت کی کشمکش میں گرفتار ہے، لیکن میں اس کی موت سے پہلے مرجانا چاہتا ہوں، آپ میرا اقبالی بیان لکھ لیجیے سر! میں قاتل ہوں، میں نے بدترین جرم کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں وہی کروں گا جو قانون کہتا ہے لیکن ایک انسان کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ایک آبرومند عورت کی بے حرمتی تو نہ کریں، جواب اس دنیا میں بھی نہیں ہے۔''

''آہ......میں کیا کروں۔'' طاہر علی نے پُراضطراب لہجے میں کہا۔

اتنی دیر میں اردلی نے اندر آ کر ایڑیاں بجائیں اور بولا۔ ''سر! ایک بندہ آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے، کہتا ہے کہ وہ طاہر علی کے کیس میں، بہت ضروری اطلاع دینا چاہتا ہے۔''

اردلی کی آمد پر شاہ میر کا موڈ بگڑا تھا لیکن طاہر علی کے کیس کے بارے میں سن کر اس نے گردن ہلا کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، ادھر ہی لے آؤ۔''

آنے والا شکل ہی سے غنڈہ لگتا تھا۔ اچھے تن و توش کا مالک تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے شاہ میر کی طرف توجہ دینے کے بجائے طاہر علی کو دیکھا اور بولا۔ ''اوئے کمینے، ذلیل......! یہ دوستی ہے تیری، میرے کو کچھ بتایا بھی نہیں، سب کچھ کر بیٹھا، او میں مر گیا تھا کیا؟''

''سٹیم کون ہو، پولیس اسٹیشن آئے ہو یا اپنی خالہ کے گھر! کون ہو اور کیوں آئے ہو؟'' شاہ میر کی کرخت آواز ابھری۔

وہ چونک پڑا، پھر بولا۔ ''معافی چاہتا ہوں سر جی! میرا نام امیر شاہ ہے، اس کا جگری یار ہوں، ٹرانسپورٹ کا کام ہے میرا۔ سر جی مجھے تو کچھ معلوم نہیں تھا، اس کے بارے میں آپ کو ساری باتیں میں بتاؤں گا، پوری تفصیل معلوم کر کے آیا ہوں۔''

''بیٹھو!'' شاہ میر نے اسے ایک بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے کہا اور وہ بیٹھ گیا۔ ''ہاں......بولو!''

''مالک ہو آپ جی! جیسے چاہو پیش آؤ، میں اس کے لیے آیا ہوں، ورنہ میں بھی سڑک چھاپ نہیں ہوں، چار ٹرک چلتے ہیں میرے، خیر تو میں نے عدالت سے اس کیس کے سارے پیپروں کی نقل لے لی ہے۔ سر جی یہ کہتا ہے اس نے اپنی بھابی قتل کی ہے، اس کی آبرو لوٹی ہے، میرے کو ایک بات بتاؤ سر جی، کوئی اپنی ماں کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے، کوئی اپنی بہن کو بے آبرو کر سکتا ہے۔ سر، یہ پاگل ہے، اپنے بھائی کی موت کے خیال سے دیوانہ ہو گیا ہے، آپ کو پتا نہیں سر جی! یہ اپنے بھائی کی جان بچانے کے لیے جانوروں کی طرح محنت کرتا رہا ہے، پتا نہیں اسے کیا ہو گیا، مایوسی نے اس کے حواس چھین لیے ہیں، میں دعوے سے کہتا ہوں اس نے ایسا کچھ نہیں کیا، قاتل کوئی اور ہی ہے۔''

''آپ اس کی بے گناہی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں تو بتائیے۔''

''جی وہی بتانے آیا ہوں، یہ بندہ تو کسی چڑیا کو بھی نہیں مار سکتا، میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ذیشان فاروقی نامی ایک بندہ ہے، وہ کالج کے زمانے سے سعیدہ سے محبت کرتا تھا اور اسے تنگ کرتا تھا۔ سعیدہ کی شادی افسر علی سے ہو گئی مگر وہ شادی کے بعد بھی سعیدہ کو پریشان کرتا رہا، یہ بات افسر علی کو پتا چل گئی اور اس نے ذیشان فاروقی کی گرفت کی تو اس نے افسر علی کو پانچ لاکھ روپے دیے اور شرمندگی کا اظہار کیا، لیکن پھر اس نے افسر علی کو اور پیشکش کی اور کہا کہ وہ اس کا پورا علاج کرائے گا، بس اسے سعیدہ سے ہر طرح کے تعلقات استوار کرنے کی اجازت دے دے، ورنہ اس کی موت کے بعد وہ سعیدہ پر قبضہ جمالے گا، افسر علی نے اسے بہت برا بھلا کہا جس پر ذیشان نے اسے دھمکی دی کہ اب وہ تماشا دیکھے......جو کچھ وہ کرے گا افسر علی سوچ بھی نہیں سکتا اور پھر اس نے سعیدہ بھابی کو قتل کر دیا اور یہ پاگل سمجھا کہ سعیدہ کو افسر علی نے قتل کیا ہے، یہ بس اپنے بھائی کو بچانے کے لیے مجرم بنا ہے جبکہ اصل قاتل ذیشان فاروقی ہے۔''

''ویری گڈ......! لیکن آپ کو یہ تفصیل کیسے معلوم ہوئی؟''

''میری افسر علی سے بھی دوستی ہے، وہ مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپاتا۔''

''ٹھیک......لیکن یہ کہتا ہے کہ اس نے اپنی بھابی کی آبروریزی بھی کی ہے؟'' شاہ میر نے کہا۔

''جی چاہتا ہے اتنے جوتے اس کے منہ پر ماروں کہ جبڑا ٹوٹ جائے، یہ اس عورت کے لیے ایسے الفاظ کہہ رہا ہے جسے یہ ماں کا مقام دیتا تھا، یہ اپنے بھائی کی زندگی کے لیے پاگل ہے۔ سر جی......! آپ ذیشان کو گرفتار کر لو، آپ کے لیے کیا مشکل ہے اس سے سچ اگلوا لو۔''

''ایک بات بتائیے امیر شاہ! ذیشان نے پانچ لاکھ روپے افسر علی کو دیے تھے، پھر وہ طاہر علی کے اکاؤنٹ میں کیسے چلے گئے؟''

''آپ نے اس سے یہ نہیں پوچھا، خیر میں بتاتا ہوں۔ افسر علی نے یہ رقم اسی کے اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرائی تھی، یہ کہہ کر کہ وہ بعد میں بتائے گا کہ یہ کیسی رقم ہے لیکن اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ رقم کہاں سے آئی۔''

''ہوں! تو آپ کے خیال میں سعیدہ کا قاتل ذیشان فاروقی ہے؟''

''ہم سے ہزار گنا سمجھدار آپ ہیں، افسر جی! ہمارے دوست کو بچالو، ہم آپ کی پوری خدمت کریں گے۔''

''بہت شکریہ! ہماری آپ سے ملاقاتیں رہیں گی، آپ اپنا یہ بیان لکھوا دیجیے۔'' شاہ میر نے کہا اور زمان شاہ کو طلب کر کے اسے ہدایت کی کہ وہ امیر شاہ کا بیان لکھ کر اس کا مکمل پتا اور شناختی کارڈ کی کاپی لے لے۔ زمان شاہ، امیر شاہ کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا تھا۔

شاہ میر نے مسکراتی نظروں سے صفورا کو دیکھا تو وہ بولی۔ ''گڑبڑ......!''

''وضاحت جہاں پناہ!'' شاہ میر نے کہا۔

''یہ شخص ہضم نہیں ہو رہا۔ شکل تو خیر جیسی ہے، شخصیت بھی مشکوک ہے، چار ٹرکوں کا مالک، اتنی تفصیل جاننے والا اور......!'' صفورا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

کچھ لمحے خاموشی طاری رہی، پھر شاہ میر نے زمان شاہ کو طلب کر لیا۔ اس نے اندر آ کر ایڑیاں بجائی تھیں۔ ''امیر شاہ کا بیان ہو گیا شاہ جی!''

''ٹھیک ہے۔ مظفر اور علی خان کو اس شخص کے پیچھے لگا دو، ان سے کہو چوبیس گھنٹے سائے کی طرح اس کے پیچھے رہیں، ایک اور جوڑی منتخب کر و جوان سے ڈیوٹی بدل لے۔''

''یس سر......!'' زمان شاہ نے سلوٹ کیا اور باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

ذیشان نے موبائل پر نمبر دیکھا۔ اجنبی نمبر تھا۔ اس نے فون آن کر لیا اور بولا۔ ''جی کون......؟''

''پرانا خادم نئے نمبر سے بول رہا ہے۔'' ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ ذیشان کا چہرہ اتر گیا لیکن اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔

''بات صرف بے چاری سعیدہ کے قتل اور طاہر کی گرفتاری کی نہیں اور بھی، بہت سے مسئلے ہیں، اب میں کھیل بدل رہا ہوں، ظاہر ہے بے چارے طاہر کو بے گناہ پھانسی کے پھندے تک نہیں جانے دوں گا، اسی کے لیے تو میں نے اتنی قربانیاں دی ہیں، اب میری پلاننگ کا دوسرا حصہ شروع ہو رہا ہے، پھانسی کا پھندا رخ بدل رہا ہے، اب وہ تمہاری طرف چل پڑا ہے یعنی تمہاری زندگی کی قیمت صرف ایک کروڑ......! بچ سکتے ہو تو تھوڑا بہت ڈسکاؤنٹ بھی کیا جا سکتا ہے، رعایت ہو جائے گی، بس یہ آخری موقع ہے۔''

ذیشان کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''میں مجبور ہوں افسر علی! تمہیں علم ہے کہ یہ دولت میرے سسر کی ہے، فرم کا جوائنٹ اکاؤنٹس ہے، تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میری بیوی نیم پاگل عورت ہے، اس کو پتا چل جائے تو میرا کیا حشر ہوگا کہ تم نہیں جانتے۔''

''اور دوسری صورت میں تمہارا کیا حشر ہوگا، تم نہیں جانتے، ویسے تمہارے ذاتی اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے؟''

''ذاتی اکاؤنٹ......؟'' ذیشان نے کہا۔

''کہو تو اکاؤنٹ نمبر بھی بتا دوں؟'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ذیشان کا سانس پھولنے لگا۔ ''تیس لاکھ اسّی ہزار......! جب تک پوری رقم کا بندوبست نہ ہو، تم ان میں سے پچیس لاکھ نکال لو، باقی کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔''

''میری بات سنو!'' ذیشان نے کہا۔

''تم میری بات سنو، بینک سے رقم نکال لو، جگہ میں بتا دوں گا، رقم کے ساتھ پچیس فیصد خطوط تمہیں واپس مل جائیں گے، تم پر میری گہری نظر رہے گی، کوئی حرکت تمہیں جو نقصان پہنچائے گی، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' فون بند ہو گیا۔ ذیشان دیر تک فون ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا، پھر اچانک اس کے چہرے پر سختی نظر آنے لگی۔ اس نے شاہ میر کا کارڈ جیب میں تلاش کیا، پھر موبائل پر اسے کال کرنے لگا۔

''سر! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں خیریت......؟''

جواب میں ذیشان اسے پوری تفصیل بتانے لگا۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد شاہ میر نے کہا۔ ''مجھ سے ملنا آپ کے لیے خطرناک ہوگا لیکن آپ اس کی ہدایت پر عمل کریں، رقم نکال لیں، مجھ سے کسی اور فون پر بات کریں اور تمام صورتحال سے آگاہ رکھیں۔''

''سر! میں خوف زدہ ہوں، اسے آپ سے رابطے کی خبر مل گئی تو وہ مجھے گولی بھی مار سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، مر جائیے...... دوسری صورت میں جو کہہ رہا ہوں، وہ کریں۔''

دوسری طرف سے فون بند ہو گیا اور ذیشان گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

☆......☆......☆

زمان شاہ نے رپورٹ دی۔ ''سر، امیر شاہ کے بارے میں معلومات حاصل ہو چکی ہیں، وہ ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک ہے، مکمل جاہل آدمی ہے اور خطرناک غنڈہ مانا جاتا ہے، یہ کمپنی پہلے کسی اور کی تھی، اس کا مالک قتل ہو گیا اور اب کمپنی کا مالک امیر شاہ ہے۔''

''ٹھیک......اس کی نگرانی کون کر رہا ہے؟''

''اب میں نے حامد خان اور شفیع اللہ کی ڈیوٹی لگائی ہے۔''

''بالکل ٹھیک! ان سے کہو ایک لمحے کی چوک خطرناک ہوگی، اس لیے مکمل ہوشیار رہیں اور اب تم سنو، تمہیں پوری احتیاط کے ساتھ ذیشان فاروقی کی نگرانی کرنی ہے، وہ بینک سے رقم نکالے گا۔'' شاہ میر، زمان شاہ کو ہدایات دیتا رہا۔

☆......☆......☆

ذیشان فاروقی بری طرح نروس تھا۔ اس کی تو قسمت ہی تاریک ہو گئی تھی۔ شاردا اس کے لیے ناسور تھی اور اسے اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ وہ وقت بہت اچھا تھا جب بینک کی نوکری کرتا تھا۔ نہ دولت ہوتی، نہ کسی بلیک میلر کے چنگل میں پھنستا۔ بہتر تو یہ ہے کہ یہ خطوط شاردا ہی کے حوالے کر دے، طلاق کے سوا اور کیا ہوگا، سب کچھ بھاڑ میں جائے۔ افسر علی اپنی بیماری کے جنون میں بے چاری سعیدہ کو قتل کر چکا ہے اور اب اس کی جان کے پیچھے لگا ہوا ہے۔

نہ جانے کیوں شاہ میر سے مل کر اسے کچھ ڈھارس ہوئی تھی۔ یہ پولیس افسر کچھ کر دکھائے گا۔ دوسرے دن پروگرام کے مطابق اس نے بینک سے رقم وصول کی اور آفس آ گیا۔ اعصاب بری طرح کشیدہ تھے، وقت پل پل کر کے گزر رہا تھا۔ دیکھیں بلیک میلر رقم کی وصولیابی کے لیے کہاں طلب کرتا ہے، اس نے ایک بجے کا وقت دیا تھا۔

اس وقت بارہ بج کر دس منٹ ہوئے تھے کہ باہر کے دروازے پر چپڑاسی کے کسی سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں، پھر دروازہ کھلا اور ایک خطرناک صورت توانا آدمی اندر گھس آیا۔ چپڑاسی اس کے پیچھے تھا۔

''سر! میں نے ان سے کہا کہ صاحب آج کسی سے نہیں ملیں گے، مگر یہ صاحب زبردستی اندر گھس آئے ہیں۔''

''او کمال ہے صاحب! کیسے بزنس مین ہیں آپ، لاکھوں روپے کی ڈیل ہے اور آپ نے ملاقات پر پابندی لگا رکھی ہے۔''

''کون ہیں آپ، کیا کام ہے؟'' ذیشان نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''او جناب......! آپ سے ایک بجے ملاقات کی بات ہوئی تھی، تھوڑے ٹائم پہلے آ گئے تو یہ سلوک ہو رہا ہے؟'' یہ کہہ کر نو وارد نے آنکھ ماری تو ذیشان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''اوالہ دین کے چراغ! اب ٹو دفع ہو جا، صاب جی نے ہمیں پہچان لیا ہے۔'' اس شخص نے چپڑاسی سے کہا، پھر بولا۔ ''او فاروقی صاحب! اسے دفع کرو۔''

''جاؤ!'' ذیشان نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا اور چپڑاسی باہر نکل گیا۔

تب نو وارد ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''ہماری آواز پہچان لی ہوگی فاروقی صاحب! نام بتانا ضروری نہیں ہے۔''

''کون ہو تم......؟'' ذیشان نے کرخت لہجے میں کہا۔

''تمہارے مہمان ہیں، ہم نے سوچا کہ فلموں والے بلیک میلروں کی طرح تمہیں کسی سنسان جگہ پر بلائیں، وہاں پولیس چھپی ہوگی، گولیاں چلیں، کیا فائدہ......! کیوں نہ تمہارے دفتر میں ہی لک مکا کر لیں۔''

''کیسا لک مکا......؟''

''اوں ہوں! تفصیل ضروری ہے کیا، ہمارا آنا کافی نہیں ہے؟''

''پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''کام کی بات کر و یار! اداکاری کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، پچیس لاکھ نکالو، پچیس فیصد خط وصول کرو، تمہارے پاس رقم ہے، میرے پاس تمہارے اصلی خط ہیں اور پھر اب تو بات خالی خطوں کی نہیں ہے اور بھی معاملے ہیں، تم جانتے ہو لیکن سارے برے کام بڑی ایمانداری سے ہوتے ہیں، یہ خط ہیں، رقم نکالو۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

''مگر یہ خط تمہارے پاس کہاں سے آئے؟''

''جہنم سے!'' اس نے کسی قدر درشت لہجے میں کہا۔

''سعیدہ کو کس نے قتل کیا؟''

''قاتل اقرار کر چکا ہے اسے سزائے موت ہو جائے گی۔''

''تم پولیس کو بے وقوف سمجھتے ہو؟''

''کیوں......؟''

''اسے کوئی ثبوت نہیں ملے گا، ویسے ایک بات بتاؤ افسر علی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''کام کی بات نہیں کرو گے، بات بہت آگے تک جائے گی، ان خطوط میں تم نے سعیدہ کو قتل کرنے تک کی دھمکی دی ہے۔''

''تم کون ہے خطوط لائے ہو؟''

''تمہیں دکھا سکتا ہوں، کام کھرا اور ایمانداری سے ہو رہا ہے، یہ دیکھو۔'' اس نے بیگ سے ایک بڑا لفافہ نکالا اور اس میں سے کچھ خطوط نکال کر دکھائے، پھر بولا۔ ''سعیدہ کے قتل کے بعد ان خطوط کی اہمیت بڑھ گئی ہے، پہلے یہ صرف تمہاری بیوی کے لیے تھے کہ انہیں دیکھ کر وہ تم سے محبت کا اظہار کرتی لیکن اب یہ پولیس کے لیے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہوں گے کیونکہ ان میں تم نے سعیدہ کو قتل کی دھمکی بھی دی ہے۔''

''افسر علی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' ذیشان نے دوبارہ پوچھا۔

''کیا تم کسی کا انتظار کر رہے ہو، اگر نہیں تو وقت کیوں ضائع کر رہے ہو، لاؤ رقم نکالو۔'' نو وارد کی غراہٹ سنائی دی اور ذیشان خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے نوٹوں کے بنڈل اس کے سامنے رکھ دیے جنہیں اس نے چیک کر کے اسی بیگ میں رکھا اور اس میں سے پیک کیے ہوئے خطوط نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔

''باقی خطوط......؟''

''معاہدے کے مطابق ملتے رہیں گے، پوری رقم کا بندوبست کر کے گلوخلاصی حاصل کر لو۔''

ذیشان گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

☆......☆......☆

شاہ میر کے ساتھی پوری مستعدی سے اپنا کام کر رہے تھے۔ ایک طرف امیر شاہ کی سخت ترین نگرانی ہو رہی تھی تو دوسری طرف ذیشان پر بھرپور نظر رکھی جا رہی تھی۔

اس وقت بھی شاہ میر ایک پولیس موبائل میں موجود تھا اور صفورا وائرلیس پر پیغامات موصول کر کے شاہ میر کو رپورٹ دے رہی تھی۔ بلیک میلر نے ذیشان کو ایک بجے کا وقت دے رکھا تھا، اس لیے وہ لوگ مستعد تھے۔

صفورا نے ایک کارآمد نکتہ اٹھایا۔ ''سر! نہ جانے کیوں مجھے ایک بات پر الجھن ہے، آپ نے اس رات افسر علی کو اس کے گھر میں دیکھنے کے باوجود اسے نظرانداز کیا جبکہ رقم کی وصولیابی کے سلسلے میں اس پر نظر رکھنا ضروری تھا۔''

''مس صفورا! اگر رقم کی وصولیابی کے لیے رات کا وقت رکھا جاتا تو میں افسر علی کی نگرانی ضرور کرتا، دن کی روشنی میں وہ اسپتال سے غائب ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ......!''

''یہ کام وہ کسی اور سے بھی......!'' ابھی شاہ میر نے اتنا ہی کہا تھا کہ وائرلیس پر اشارہ موصول ہوا اور صفورا پیغام سننے لگی۔ انہیں پتا چل چکا تھا کہ ذیشان بینک سے نکل کر اپنے آفس آ گیا ہے۔ دوسری دلچسپ اطلاع اب ملی تھی۔

''امیر شاہ ٹرک اڈے سے چل پڑا ہے، وہ سفید رنگ کی مہران میں ہے اور اسے خود چلا رہا ہے، اس کا رخ ایڈن روڈ کی طرف ہے۔'' اطلاع دینے والے نے وائرلیس پر مسلسل رابطہ رکھتے ہوئے بتایا۔ ''وہ ذیشان کے آفس والی عمارت کے سامنے رکا ہے۔'' پھر اطلاع ملی کہ امیر شاہ، ذیشان کے آفس میں داخل ہوا ہے۔

''سر......! امیر شاہ۔'' صفورا نے سرسراتی آواز میں کہا۔ شاہ میر نے پولیس موبائل کا رخ ایڈن روڈ کی طرف کرا دیا۔ کچھ دیر کے بعد پولیس موبائل ایڈن روڈ پر اس جگہ پہنچ گئی جہاں ذیشان کا آفس تھا۔ یہاں بہت سی کاریں کھڑی تھیں لیکن سفید رنگ کی مہران ایک ہی تھی۔

''یہ بھی اتفاق ہے کہ سفید رنگ کی مہران ایک ہی ہے ورنہ اس کا نمبر پوچھنا پڑتا۔''

''سر! ہمارے آدمی......؟'' صفورا آہستہ سے بولی۔

''میں نے دیکھ لیا ہے، تم بیٹھو اور شمس موبائل اس طرف ہورڈنگ کے پیچھے کر لو۔'' شاہ میر نے ڈرائیور سے کہا اور زمان شاہ کو اشارہ کر کے موبائل سے نیچے اتر گیا۔

مہران سے چند گز آگے چل کر وہ کاروں کی آڑ میں رک گئے، پھر انہیں تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار انہوں نے امیر شاہ کو اس عمارت کے صدر دروازے سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑی لاپروائی سے چلتا ہوا مہران کی طرف بڑھا لیکن جونہی اس نے دروازہ کھولنے کے لیے چابی نکالی، شاہ میر اس کے سامنے آ گیا۔

امیر شاہ نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر شاہ میر کو دیکھا، پھر خود کو سنبھال کر بولا۔ ''او انسپکٹر صاحب! میں نے آپ کو پہچان لیا۔''

''واقعی......؟'' شاہ میر نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

''بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی انسپکٹر صاحب! آپ کا انداز کچھ عجیب سا ہے؟'' وہ لہجہ بدل کر بولا۔

''اتفاق سے آپ سے یہاں ملاقات ہو گئی۔'' شاہ میر نے اس بار بڑی شرافت سے کہا۔

''او اچھا! میں تو گھبرا گیا تھا، ویسے میں آپ کے پاس خود آنے کے لیے سوچ رہا تھا۔''

''کوئی کام تھا مجھ سے......؟''

''بس جناب! میں طاہر علی کے لیے بہت پریشان ہوں، بڑی پرانی دوستی ہے ہماری، آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں انسپکٹر صاحب!'' شاہ میر کا رویہ دیکھ کر امیر شاہ کو کچھ ڈھارس ہوئی تھی۔

''یہاں کہاں آئے تھے آپ امیر شاہ!'' شاہ میر نے پوچھا۔

''بس جناب! کمپنیوں سے ڈیل رہتی ہے، ٹرک لوڈ کرنے میں حساب کتاب چلتا رہتا ہے، آپ سے بڑی باتیں کرنی تھیں، معاف کیجیے دنیا کے کام ایک دوسرے سے ہی چلتے ہیں۔''

''بالکل......بالکل! ہمارے لیے کوئی حکم تو بتائیے؟''

''وہی ایک کام ہے اور اسی کے لیے ہم آپ کے پاس آنا چاہتے تھے، آپ سے پھر وہی درخواست کریں گے کہ طاہر علی کو چھوڑ دیں، شریف بندہ ہے، آپ اصل مجرم کو تلاش کریں۔''

''اسی کی تلاش میں تو مارے مارے پھر رہے ہیں، آپ لوگ کچھ مدد کریں تو اصل بندہ ہاتھ آئے۔''

''ہم تو دل سے تیار ہیں، اس بے چارے کی ضمانت کرا دیں، ہم لیں گے اس کی ضمانت!''

''اوہو......واقعی......؟''

''ہاں......کیوں نہیں، ہمارا جگری یار ہے وہ!''

''آیئے پھر تھانے چلتے ہیں، آپ خانہ پری کیجیے، دیکھیں گے کیا صورتحال ہوتی ہے۔''

''آپ اِدھر کیسے آئے تھے انسپکٹر صاحب!''

''بس یوں سمجھ لیجیے آپ کے لیے ہی آئے تھے۔''

''نہیں! میں یوں کہہ رہا تھا کہ ایک ضروری کام تھا، میں گھنٹہ بعد تھانے آ جاتا ہوں۔''

''ارے نہیں شاہ جی! وہ جو کہتے ہیں کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں، ممکن ہے اس وقت ہم دونوں کا فائدہ ہو جائے۔'' شاہ میر بھی لطف لے رہا تھا۔

امیر شاہ اس کے موڈ کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کام بڑا ضروری تھا سر جی! بس گھنٹہ دے دو، آپ یہاں جس کام سے آئے تھے، وہ کام کر لو، ہم اپنا کام کر کے تھانے آ جاتے ہیں۔''

''ارے نہیں امیر شاہ! نیک کام سب سے پہلے کرنے چاہئیں، آپ پہلے اپنے دوست کی زندگی بچانے کی کوشش کریں، اس کے بعد کوئی دوسرا کام!''

''ہم اس وقت نہیں جا سکتے۔''

''کوئی بہت ضروری کام ہے کیا......؟''

''ہاں، وہی تو۔ بہت بڑی ڈیل ہے، چھوڑ دیں گے تو لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا۔'' امیر شاہ کے چہرے پر اب گھبراہٹ نمودار ہونے لگی تھی۔

''اوہو! شاید اس ڈیل کی ایڈوانس رقم ملی ہے آپ کو، اس بیگ میں وہی رقم ہے؟'' شاہ میر نے بیگ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''جی......جی ہاں......جی نہیں...... مطلب!'' امیر شاہ گڑبڑا کر بولا۔ ''میں سمجھا نہیں؟''

''وہی سمجھانے کے لیے تو آپ کو تھانے لے جا رہے ہیں۔'' شاہ میر نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب امیر شاہ کو صورتحال کا کچھ احساس ہو گیا۔ اس نے پھرتی سے شاہ میر کا ہاتھ جھٹک کر جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا لیکن اسی وقت شاہ میر نے برق رفتاری سے اس کی پشت پر آ کر اس کی بغل میں قینچی لگا دی۔ ایک عجیب و غریب داؤ تھا لیکن امیر شاہ جیسا تنومند آدمی بے بس ہو گیا۔ اس نے پلٹنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ شاہ میر نے اسے جھٹکا دے کر جھکایا اور اس کی جیب سے پستول نکال لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے امیر شاہ کے ہاتھ میں لٹکا بیگ چھین لیا۔ ساتھ ہی اس نے کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا اور کانسٹیبلوں نے امیر شاہ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

امیر شاہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے بمشکل آواز نکلی۔ ''یہ......یہ کیا ہے انسپکٹر صاحب!''

''ضمانت کی تیاریاں ہو رہی ہیں، آپ سے کہا تھا کہ تھانے چل کر بے چارے طاہر علی کی ضمانت کرا لیجیے، آپ نہیں مانے، چلیے، لے چلو انہیں!'' شاہ میر نے کانسٹیبلوں سے کہا اور کانسٹیبلوں نے اسے کھینچ کر موبائل میں بٹھا دیا۔ کچھ لمحوں کے بعد موبائل تھانے کی جانب چل پڑی۔

صفورا نے دور سے یہ منظر دیکھا تھا اور شاہ میر کے بہترین انداز کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ دوسری طرف امیر شاہ کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

تھانے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے خود کو سنبھال لیا پھر جب اسے موبائل سے اتارا گیا تو اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''غلطی کی ہے تم نے سر جی! بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے، ہم شریف آدمی ہیں مگر ہماری بھڑیں بڑی تیکھی ہیں، اگر بال بچوں والے ہو تو اکیلے تمہیں نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ......!'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ارے نہیں امیر شاہ جی! آپ بھی شاہ، ہم بھی شاہ......! ہمارے بیچ کیا جھگڑا، وہ تو بس تھوڑی سی معلومات کرنی تھی جس کے لیے آپ کو یہاں لایا گیا ہے۔''

''ہتھکڑی ڈال کر!'' امیر شاہ اوپری ہونٹ بھینچ کر بولا۔

''لو جی۔ پولیس والوں کے پاس اور ہوتا ہی کیا ہے، ہتھکڑی، ڈرائنگ روم اور پھر پھانسی!''

''ڈرا رہے ہو مجھے، غلطی پر غلطی کر رہے ہو، بہت لمبے ہاتھ ہیں میرے، نوکری پر نہیں رہ سکو گے۔''

''ارے نہیں شاہ جی! پتا نہیں آپ کیا سوچ رہے ہیں، بس تھوڑی سی معلومات کرنی ہیں آپ سے اور پھر چھٹی!''

''معلومات اس طرح کی جاتی ہیں؟'' امیر شاہ نے کہا۔

''بتایا تو ہے آپ کو۔ پولیس کے پاس اور ہوتا ہی کیا ہے، ہتھکڑی اور ڈرائنگ روم! ہتھکڑی آپ کے ہاتھوں میں ہے اور ڈرائنگ روم آپ کو ابھی دکھاتے ہیں، آیئے۔''

امیر شاہ کوئی شریف آدمی نہیں تھا، پولیس کے ڈرائنگ روم سے اسے پوری واقفیت تھی۔ اس نے ایک نگاہ کمرے کو دیکھا، پھر بولا۔ ''آخر میرا جرم کیا ہے، یہ سب کیوں کر رہے ہو تم میرے ساتھ انسپکٹر!''

''بیٹھیے۔ بات ہوتی ہے آپ سے......جی۔ اس بیگ میں کیا ہے؟''

''رقم ہے تھوڑی سی!''

''یعنی پچیس لاکھ......!'' شاہ میر نے کہا۔

امیر شاہ ایک بار پھر نروس ہو گیا لیکن اس نے مدافعت پھر بھی نہ چھوڑی۔ وہ بولا۔ ''ضرور تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''یعنی یہ پچیس لاکھ نہیں ہیں۔''

''اتنے ہی ہیں۔''

''اور یہ رقم آپ نے ذیشان فاروقی کو بلیک میل کر کے لی ہے۔''

''فرض کرو ایسا ہے تو پھر......تم اپنا حصہ بتاؤ؟'' امیر شاہ نے کہا۔

''ہاں! ہوئی نا کام کی بات!''

''دو لاکھ نکال لو اس میں سے۔'' امیر شاہ بولا۔

''صرف دو لاکھ......! چلیں چھوڑیں، یہ فیصلہ بعد میں کر لیں گے، ان سے ملیں یہ سب انسپکٹر زمان شاہ ہیں، بڑی خوبیوں کے مالک ہیں، اصل میں یہ بہت پریشان ہیں کہ آخر امیر شاہ صاحب کا طاہر علی سے اصل تعلق کیا ہے، میں نے کہا بھائی! تم خود معلوم کر لو، اسی لیے آپ کو یہاں زحمت دی گئی ہے، اصل میں یہ ڈرائنگ روم انہیں نے ڈیکوریٹ کیا ہے، چنانچہ اب آپ دونوں محبت کی باتیں کریں، پھر ملاقات ہوگی۔'' شاہ میر نے نوٹوں کا بیگ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔

☆......☆......☆

فون ذیشان فاروقی کا تھا۔

''جی فاروقی صاحب......!''

''انچارج صاحب! مجھے ایک خبر ملی ہے، آپ نے میرے آفس کے سامنے سے ٹرانسپورٹر امیر شاہ کو گرفتار کیا ہے؟''

''ہاں! وہ میرے پاس خیریت سے ہے، ویسے آپ نے مجھے اطلاع نہیں کی کہ وہ آپ سے پچیس لاکھ لے گیا ہے؟''

''میں نے اس خیال سے......!''

''آپ میرے پاس تھانے آ جایئے۔'' شاہ میر نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ذیشان نے پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ نوٹوں کا بیگ شاہ میر کی میز پر رکھا تھا۔ ذیشان نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ شاہ میر نے بیگ ذیشان کی طرف کھسکا کر کہا۔ ''آپ کی نیک کمائی کی واپسی، چیک کر لیجیے گا۔''

''جی......!'' ذیشان کی آواز لرز گئی۔

''آپ نے میرے کہنے سے سب کچھ کیا، اس رقم کی واپسی مجھ پر فرض تھی، یہ حاضر ہے، میری آپ سے صرف ایک درخواست ہے۔ میرے سوال کا صحیح جواب دے دیں، سعیدہ کا قتل کسی جذباتی دباؤ کا نتیجہ تھا؟''

ذیشان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے زندگی میں صرف خود پر ظلم کیا ہے، کسی کی انگلی تک کو نقصان نہیں پہنچایا۔''

''ٹھیک ہے، جایئے، میں آپ کی طرف سے مطمئن ہوں۔''

ذیشان گیا ہی تھا کہ زمان شاہ مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔

''کام کی خبر لائے ہو زمان شاہ......؟''

''سر جی......! ایک نمبر کا بدمعاش ہے، دس نمبر کے آلات استعمال کرنے پڑے، اپنے باپ، دادا کے کیے ہوئے جرائم بھی کھول دیے، سعیدہ کا قاتل وہی ہے، اس نے اسے بے آبرو کیا تھا، بڑی گندی کہانی ہے سر......! خدا غارت کرے ان بے ضمیروں کو جو دولت کے لیے انسانیت کو شرمندہ کرتے ہیں، طاہر علی اچھا انسان تھا لیکن امیر شاہ کے بہکاوے میں آ کر وہ بھی دولت مند بننے کے خواب دیکھنے لگا، امیر شاہ نے اسے اپنے کاروبار میں شامل ہونے کی دعوت دی اور رقم کے حصول کا ذریعہ بتایا جسے اس نے قبول کر لیا، بھائی کی زندگی سے وہ پہلے ہی مایوس ہو گیا تھا، اسی کے ذریعے امیر شاہ کو ذیشان کے عشق کی کہانی معلوم ہوئی اور دونوں نے ذیشان کے بارے میں تفصیل معلوم کر کے اسے بلیک میل کرنے کا فیصلہ کیا۔ سعیدہ کو قتل کر کے ذیشان کو پھنسانے کا منصوبہ بھی امیر شاہ کا تھا، خطوط کے عوض وہ پانچ، دس لاکھ تو دے سکتا تھا لیکن سعیدہ کے قتل کی ذمہ داری اس پر آ پڑتی تو اسے ایک کروڑ دینے ہی پڑتے۔ چنانچہ سعیدہ کو بے آبرو کر کے قتل کرنے کا عمل پایۂ تکمیل پہنچا۔ طاہر علی نے خود کو قاتل کی حیثیت سے اس لیے پیش کیا کہ ذیشان کا نام سامنے آئے اور اس کے لکھے خطوط اسے قاتل ثابت کر دیں، گویا ایک کروڑ بھی حاصل ہو جائیں اور ذیشان بھی پھانسی چڑھ جائے، بس یہ ہے کل کہانی......!''

''لیکن کینسر کا مریض افسر علی اس رات اپنے گھر کیوں گیا تھا؟'' صفورا نے پوچھا۔

''یہ بات وہ خود ہی بتائے گا لیکن بیوی کی موت کی کہانی اور بھائی کے اعتراف نے اسے ہیجان میں مبتلا کر دیا ہوگا، ممکن ہے اسے شواہد کی تلاش ہو جس سے حقیقت سامنے آئے، ہمارے سامنے سب سے مشکل مرحلہ یہی ہوگا کہ ہم ایک قریب المرگ شخص کو ایسی روح فرسا داستان سنائیں۔''

طاہر علی کو شاہ میر نے بلایا۔ وہ چہرے پر افسردگی لیے شاہ میر کے سامنے آ گیا۔ ''میں نہیں جانتا انسپکٹر صاحب! آپ ایک قاتل کے ساتھ اتنی رعایت کیوں برت رہے ہیں، میں جینا نہیں چاہتا۔''

''معافی چاہتا ہوں طاہر علی! اب آپ کی یہ خواہش پوری ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا، ہمیں پوری کہانی کی تلاش تھی، افسوس آپ اور امیر شاہ مل کر ذیشان فاروقی کو موت کی سزا نہیں دلوا سکے، بے چارہ امیر شاہ آدھی چھوڑ ساری کے پیچھے پڑا، اس کی آدھی بھی گئی۔''

''کک......کیا مطلب!'' طاہر علی پہلی بار بوکھلا کر بولا۔ اسی وقت زمان شاہ پروگرام کے مطابق امیر شاہ کو لے کر اندر آ گیا، جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر طاہر علی زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

''قانون سے کھیلنا مذاق نہیں ہوتا طاہر علی! مجرم اپنی طرف سے بڑی مکمل پلاننگ کرتا ہے لیکن قانون وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں مجرم کی ذہانت ختم ہو جاتی ہے۔''

اس کے بعد شاہ میر نے اپنا فرض پورا کیا اور اس کیس کا مکمل چالان پیش کر دیا۔

(ختم شد)